ڈاکٹر سید صفدر حسین

آئینِ وفا

آئینِ وفا مرثیہ ہے حضرتِ عباسؑ کا
اور اِس مرثیہ کی نگارش ایک ایسا عظیم "آئین"
پیش کرتی ہے جو حق کی خاطر باطل کے خلاف
جہاد و قتال کرنے والوں کے سردار سید الشہدا امام حسین علیہ السلام
اور اُن کے ساتھی مظلومانِ کربلا کے ساتھ "وفا"
کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

اِس کتاب کے اصل متن یعنی مرثیہ کے آغاز
میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ناقدین کے غور و فکر
کیلئے خاص ہے۔ میں چونکہ عامی ہوں، اِس لئے
میں نے اصل مرثیہ ہی سے واسطہ رکھا ہے۔ اور میری
رائے یہ ہے کہ وہ دل سنگ و آہن سے بھی سخت تر ہو گا۔
جو صفدر صاحب کے نظم فرمودہ جذبات سے متاثر نہ ہو۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

آئینِ وفا

بیانِ سیرت و حیاتِ حضرت ابوالفضل العباسؑ

ڈاکٹر سید صفدر حسین

کاپی رائٹ

طبع اوّل	ایک ہزار
سال طبع	۱۹۶۵ء
کتابت	سید تہذیب حسین امروہوی
مطبوعہ	استقلال پریس، لاہور
قیمت	تین روپئے

مکتبۂ دانش افروز

۴۵- شردھانند اسکوئر- ارجن روڈ- کرشن نگر- لاہور

ترتیب

اِعجازِ وفا

پیاس اِس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

قدرِ سخن

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ عربی کی کون سی صنفِ سخن فارسی کے ذریعے اُردو تک پہنچ کر ایک ایسا مقام حاصل کر چکی ہے کہ جو دُنیا بھر کے ادب میں منفرد ہے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ وہ مرثیہ ہے۔ عربی میں مغزِ سخن قصیدے کو سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اس کے مادّے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اِس کی چار شقیں ہیں یعنی (۱) المدیح (۲) الوصف (۳) الہجا، اور (۴) الرثار۔ المدیح کی اصطلاح خود ہی اپنے معانی پر دلالت کر رہی ہے۔ الوصف سے مُراد شعر کی وہ صنف ہے جس میں بیان اور اُس کے لوازم کو اہمیت دی جاتی ہے۔ الہجا، کا مفہوم بھی خود اس لفظ سے ظاہر ہے جس کو سُن کر ہجویات کا وہ تمام سلسلہ سامنے آجاتا ہے جو بعض صورتوں میں ہمارے لئے باعثِ ننگ اور بعض حالتوں میں باعثِ تفاخر ہے۔ الرثار یعنی مرثیہ کئی نوعیتوں کا ہوتا ہے مثلاً ذاتی اور شخصی، یعنی اکابرین سے کسی شخص کی وفات پر شاعر کا ماتم، یا پھر نوعی اور اجتماعی جس میں ملک و ملّت یا کسی خاص خطّے پر کسی آفت کے نازل ہونے کی صورت میں شاعر اپنے غم کا اظہار کرے۔ فارسی ادب میں انوری کا قصیدہ اِس کی مثال ہے جس کا مطلع ہے:

برسمرقند اگر بگزری اے بادِ سحر | نامۂ اہلِ خراساں بہ برِ خاقاں بر

اِس قصیدے میں اُس تباہی اور غارت گری کی تصویر کھینچی گئی ہے جو ترکانِ غز، نے ایران میں برپا کی تھی۔ قطع نظر اِن اقسام کے، مرثیے کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو عربی اور فارسی میں مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی اُردو تک یوں پہنچی کہ خاندانِ اہل بیت سے عموماً اور واقعاتِ کربلا سے خصوصاً مربوط ہو گئی۔ اس صنفِ سخن کے اپنے آداب، سلیقے، قرینے اور اصطلاحات ہیں مثلاً مطلع، چہرہ، مدح، رجز، رزم اور شہادت وغیرہ۔ لیکن اِس مختصر سے مقدمے میں ان اصطلاحات کی تشریح مناسب نہیں رہے گی۔

مرثیہ دراصل سُننے سے تعلق رکھتا ہے اور ایک تمثیل کی طرح ایک خاص فضا چاہتا ہے، جس میں ایک تقدس کا سا عنصر اور نشست و برخاست کا ایک خاص سلیقہ ہو۔ پہلے رباعیات پڑھ کر ایک فضا قائم کرنے میں معاونت کی کوشش کی جاتی ہے، پھر سلام اور آخر میں تحت اللفظ میں کامل مرثیہ پیش کیا جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ جو فضا مرثیے سے مربوط ہوتی ہے وہ تمثیل کی طرح مختلف عناصر کا تال میل اور تعاون چاہتی ہے، یعنی سامعین مرثیے پر ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھتے ہوں اور پڑھنے والا مرثیہ گوئی کے لوازم کے ساتھ ساتھ اُن تمام دلالتوں سے بھی آگاہ ہو جو مرثیہ خوانی کو ایک فن بنا دیتی ہیں اُردو مرثیے کی تنقید میں اگر ان ڈرامائی عناصر کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو انتقاد ناقص اور گمراہ کُن ہو جائے گا۔

یہ بات مُسلّم ہے کہ ہر زمانے کی معاشرت، تہذیب، تمدن، ثقافت اور تاریخی روایت، اپنے عہد کی شعری روایت، شعری اصناف کی ہئیت اور

اسلوب کو بطورِ خاص متاثر کرتی ہے۔ اِنھیں اسباب سے انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے تک غایتِ مرثیہ یہ تھی کہ مجلس میں رزم و بزم کے عناصر کے ساتھ ساتھ گریہ و بُکا کی فضا پیدا ہو۔ جس حد تک کوئی مرثیہ مُبکی ہوتا تھا اُسی حد تک وہ کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ دوسری خصوصیت اُس عہد کی یہ تھی کہ مرثیے کی اُٹھان سے لے کر اختتام تک الفاظ کا دروبست، صنعتوں کا استعمال اور زبان و بیان کی خوبیاں اُس معاشرت کے چوکٹھے میں جڑی ہوئی نظر آئیں۔ اِن اجزاء کے ساتھ ساتھ ضمناً خیر و شر کی آویزش (کہ ازلی ہے) اور دوسری عرفانی اور اخلاقی اقدار بھی اُجاگر ہوتی رہتی تھیں لیکن یہ چیزیں مرثیے کی غایت میں شامل نہ تھیں بلکہ بر سبیلِ تصادف یا بطریقِ مقصدِ ثانوی وقوع پذیر ہوتی تھیں۔

مرثیے کی تجدید دو باتوں کا تقاضہ کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دَورِ حاضر میں اُردو کے مزاج نے جو تغیّر قبول کیا ہے مرثیے کو بھی اُسی سانچے میں ڈھالا جائے اور یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ تمام قارئین اور سامعین بیان، معانی، بدیع، قافیہ اور عروض کے دلدادہ اور اُن کی ماہیت سے کاملاً آگاہ ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ مرثیے کی غایت کو ایک حد تک یوں موڑا جائے کہ مُبکی ہونا تو برقرار رہے لیکن امتدادِ زمانہ نے ہماری اخلاقی اقدار کو جس بھٹی میں ڈالا ہے اس کے تقاضے بھی ملحوظِ خاطر رکھے جائیں۔ یعنی مرثیہ کے الفاظ اُس آنچ سے اس طرح تپ کر نکلیں جس طرح کُندن نکلتا ہے۔

میرے خیال میں یہی دو باتیں مل کر نئے مرثیے کا اصلِ اصول بن جاتی ہیں۔ مُراد یہ کہ مرثیے کا اساسی ڈھانچہ (BASIC FRAMEWORK) تو قائم

رہے لیکن ہر عنصرِ معاشرت کے تغیّر اور زبان کے تبدّل کا سُراغ دے۔
میں نے صفدؔر صاحب کا جو مرثیہ پڑھا وہ حضرتِ عباسؑ کے حالات سے مربوط تھا۔ اِس مرثیے میں تین چیزیں ایسی ہیں جو اِسے تمام پُرانے مراثی سے متمیّز کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معانی و مضمون کا مرکز ہمیشہ حضرتِ عباسؑ کی ذاتِ گرامی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضرتِ عباسؑ ایک ڈھلے ڈھلائے، ترشے ترشائے سانچے میں اُترے ہوئے ٹائپ (Type) نہیں رہتے بلکہ ایک متحرّک (تمثیلی طور پر متحرّک) کردار بن جاتے ہیں۔ ایسا کردار جو بدلتے ہوئے واقعات کے مطابق اپنی ذات کے تغیّرات کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کردار ORGANIC یعنی واقعات کے مطابق بدلنے والا اور متحرّک ہو جاتا ہے اور اس میں کسی طرح کا جمود باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ آپ مرثیہ پڑھتے وقت دیکھیں گے کہ جہاں جہاں حضرتِ عباس کسی واقعے میں دخیل ہوئے ہیں انھوں نے واقعات کے تمام لوازم کو ملحوظ رکھ کر اپنے عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ کردار نگاری کی یہ صفتِ خاص کمال کی حد تک اُس اساسی ڈھانچے کے اندر رہی ہے جو عقیدت حضرتِ عباسؑ سے منسوب کراتی ہے۔ یعنی شجاعت، بسالت، امام کی فرماں برداری، طبیعت کا سوز و گداز اور عمل کی گرمی و نرمی!
دوسری بات جو اِس مرثیے میں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے وہ اِس کا تمثیلی رنگ ہے۔ اِس کی اُٹھان تمثیلی ہے، واقعات کا عمل اور ردِّ عمل، کرداروں کا تصادم اور اُن کی آویزش، غرض تمام تمثیلی سررشتے مصنفِ موصوف نے بڑی خوبصورتی سے سنبھالے ہیں۔ اور پھر اُنھیں اپنے طے شدہ مقصد کے مطابق

آگے بڑھاتے چلے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرتِ عباس کی شہادت کا مرحلہ آن لگتا ہے لیکن یہ واقعہ اُس وقت تک عمل میں نہیں آتا جب تک وہ صحیح معنی میں سقائی اہل بیت کا فریضہ ادا نہیں کرلیتے۔ اِس فریضے کے ادا کرانے میں فاضل مصنف نے جس نزاکتِ فکر اور لطافتِ بیان کا ثبوت دیا ہے اس کے استناد کے لئے میں صرف ایک شعر نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ مقام یہ ہے کہ حضرتِ عباسؑ شبِ ہشتم میں فرات سے پانی بھرلاتے ہیں اور خیمۂ امام تک پہنچادیتے ہیں۔ مرثیے میں اس موقع کی ڈرامائی کیفیت دیدنی ہے۔ اگر مجھے یہ شبہ نہ ہوتا کہ میں مدح سرائی کرنے بیٹھ گیا ہوں تو میں یہ کہنے میں گریز نہ کرتا کہ جو شعر میں نقل کروں گا وہ اُس کیفیت کے تحت کہا جاتا ہے جسے کبھی کشف، کبھی شہود، اور کبھی شعری الہام کا لقب دیا جاتا رہا ہے۔ شعر یہ ہے۔

جملہ اطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا
پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہ نے پیا

اِس شعر میں صرف انتظامی صلاحیت ہی تمثیلی انداز میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ خانوادۂ اہلِ بیت کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے زندگی کے جس سلیقے میں پرورش پاتے ہیں اُس کا اسلوب بھی نہایت خوبصورت طریقے میں ظاہر ہوتا ہے۔

تیسری بات جو اِس مرثیے میں صفدر صاحب کی انفرادیت کو آج کل کے نام نہاد مجدّدین سے جُدا کرتی ہے وہ اُن کا لفظوں پر حیرت انگیز عبور ہے۔ عموماً آج کل کے شعرا (معافی چاہتا ہوں، مرثیہ گو شعرا مراد ہیں) مرادفات اور مترادفات میں فرق نہیں کرپاتے کجا یہ کہ اُن لفظوں کی دلالتوں میں فرق کریں جن کے معانی

کا فرق صرف اُس عالم کو معلوم ہو سکتا ہے جس نے زبان کو صرف اپنے گھر ہی میں نہ سیکھا ہو بلکہ اربابِ علم کی طرح ہر پہلو سے تحصیلا بھی ہو۔ ایک ایسا منظر جس میں روشنی اور سائے مل جل کر ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر رہے ہیں اس کا بیان صفدؔر کی زبان سے سنئے۔

سرِ ساحل جو ٹہلتے تھے سلح شور جواں
اُن کو تکتی تھی حقارت سے ہر اک موجِ رواں
روشنی چاند کی دھیمی وہ میانِ میداں
سحر نور کا جیسے ہو دھندلکے میں سماں
یک بیک دُور سے بڑھتے ہوئے سائے دیکھے
کچھ جری دوش پہ مشکیزے اُٹھائے دیکھے

یہ شاعری نہیں افسوں گری ہے۔ یہ طلسمات نہیں کرامات ہے۔ منظر نگاری اور وصف کا اتنا اچھا امتزاج آج کل کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خدا صفدؔر صاحب کو توفیق دے کہ وہ مرثیے کی تجدید کیلئے برابر کام کرتے رہیں اور زمانے کی اخلاقی اقدار جو لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتی جا رہی ہیں انھیں ملحوظ رکھ کر اسی طرح مرثیے کہتے رہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ نہ تو مرثیے کا اصل مقصد فوت ہو اور نہ خانوادۂ اہل بیت کی کوئی ایسی اجنبی شکل اُبھرے جو انھیں انسانیت کی ایسی عام سطح پر لے آئے کہ جس سے عقیدت کو ٹھیس لگے اور جو مرثیے کو بہ حیثیت صنفِ سخن نقصان پہنچائے۔ کیونکہ تغیرِ اقدار کو ملحوظ رکھتے وقت بنیادی اقدار کا مُسلّم رہنا بھی ناگزیر ہے ورنہ ہم بتدریج ایسے مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں مافوق الفطرت انسانوں کو اپنی ہی سطح پر جانچنے لگیں گے۔

سیّد عابد علی عابدؔ
مدیر صحیفہ - لاہور

زاویۂ نگاہ

(مصنف کے بعض نظریات کا اقتباس)

۱

ہندوستان میں تحریکِ خلافت، بین الاقوامی اتحاد، بیداریٔ مسلمانانِ عالم اور آزادیٔ وطن کی سعی کا آغاز تقریباً ۱۹۱۲ء سے ہوا ہے اور اس جوشِ ایمانی، حرارتِ ملی اور بیداریٔ ذہن کا نمایاں عکس ہمیں اقبال کی مخصوص نظموں (تصویرِ درد، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع و شاعر، خضرِ راہ، اور طلوعِ اسلام) میں ملتا ہے۔ یہ سب نظمیں یقینی طور پر ۱۹۲۵ء سے قبل کی تصنیف ہیں اور زندگی کے رجائی پہلوؤں کی بڑی اچھی ترجمانی کرتی ہیں۔ اِن میں مسلمانوں کے لئے عزم، استقلال، ہمت اور حوصلے کا پیغام ہے۔ اِس خوددارانہ پیغام کے سمجھنے کے لئے محض یہ شعر کافی ہے۔

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

قربانی اور سرفروشی کے اس مسلک کو عملی زندگی میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑے خلوص کے ساتھ برتا۔ اُنھوں نے اپنے پیغام میں دلکشی، قوت اور تاثیر پیدا کرنے کے خیال سے امام حسینؑ کو مثالی ہیرو کی حیثیت سے پیش کر کے مسلمانوں کو ایثار

اور جاں بازی کا سبق دیا۔ چنانچہ اُن کی غزلوں میں بھی اس نوع کے اشعار کی کمی نہیں ہے۔

وہ دشت کہ آرام گہہ سبطِ نبیؐ ہے
اس دشت کو لاکھوں بھی آباد کریں گے

سینچا تھا اس کو اپنے لہو سے حسینؑ نے
اب چاہے اس چمن کو خزاں دے بہار دے

ہے بُعد کربلا سے بھی قربِ یزید بھی
اور چاہتے ہیں یہ کہ نہ ہوں پنجتن سے دُور

فرصت کسے خوشامدِ شمر و یزید سے
اب ادعائے پیروئ پنجتن کہاں

ہوں جو کثرت ہی کے قائل اُن پہ کیا
رازِ فتحِ سبطِ پیغمبرؐ کھُلے

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابنِ علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

ہم عیشِ دورِ دزہ کے بھی منکر نہیں لیکن
ایمائے شہِ کرب و بلا اور ہی کچھ ہے

خود خضرؑ کو شبّیر کی اس تشنہ لبی پہ
معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے

غزلوں سے قطع نظر نظموں میں بھی اُنھوں نے حسینؑ سے جذبۂ سرفروشی کی

ستائش کی ہے۔

نوحۂ غم سے گھٹاتے نہیں ہم شانِ حسینؑ
حق ہے شاید کہ شہادت ہی تھی شایانِ حسینؑ

آج ہے اُمتِ احمدؐ کے لیے فخر کا دن
آج کے روز ہوئی فتح نمایانِ حسینؑ

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسانِ حسینؑ

شکرِ حق ہے کہ ابھی حق کی حمایت کیلئے
جان دینے کو ہیں موجود غلامانِ حسینؑ

دولت ایثار کی لُٹتی ہے یہاں صدیوں سے
ختم ہوتا ہی نہیں گنجِ فراوانِ حسینؑ

قطعہ

نام میں اُن کے اَب وجد سے ہے نسبت تو مگر
اور دل سے بھی ہے ہر وقت ثناخوانِ حسینؑ

گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر
ہے کوثر پہ بھی وابستۂ دامانِ حسینؑ

مولانا محمد علی کی ایک اور نظم جو ۱۶ اگست ۱۹۲۲ء/محرم ۱۳۴۱ھ کی تصنیف ہے ملاحظہ ہو:

بیتاب کر رہی ہے تمنائے کربلا
یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا

ہے مقتلِ حسینؑ کی اب تک وہی بہار
ہیں کس قدر شگفتہ یہ گلہائے کربلا

روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات
جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا

جو رازِ کیمیا ہے نہاں خاک میں اُسے
سمجھا ہے خوب ناصیہ فرسائے کربلا

مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے
ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

جوہر مسیحؑ و خضرؑ کو ملتی نہیں یہ چیز
اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

مولانا محمد علی کے اس پیغام سے حضرت جوش ملیح آبادی کے سیاسی شعور کا

چراغ روشن ہوا اور انھوں نے بھی اپنی متعدد نظموں میں امام حسینؑ کو خراجِ عقیدت پیش کیا جس کا بڑا روشن نمونہ اُن کا مرثیہ ہے جو ۱۹۲۰ء میں اُنھوں نے "آوازۂ حق" کے عنوان سے تصنیف کیا تھا۔ کہتے ہیں:-

قربان ترے نام کے اے میرے بہادُر | تو جانِ سیاست تھا تو ایمانِ تدبُّر
معلوم تھا باطل کے مٹانے کا تجھے گُر | کرتا ہے تری ذات پر اسلام تفاخر

سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا
تلوار کے نیچے بھی وہی کلمۂ حق تھا

اور اس کارنامۂ صبر و استقلال کی تفصیلی وضاحت کے بعد قوم کو بیداری کا پیغام اس طرح سُناتے ہیں۔

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ | اسلام ہے پھر تیرِ حوادث کا نشانہ
کیوں چُپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ | تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر شخص حسینؑ ابنِ علیؑ ہو

اسی نوعیت کے متعدد قطعات، نظمیں، رباعیات اور سلام مولانا عاشق حسین سیمابؔ اکبر آبادی نے بھی تصنیف فرمائے جو دو علیحدہ علیحدہ مجموعوں سرودِ غم اور نفیرِ غم میں جمع ہو کر شائع ہوئے۔ ان کا اندازِ بیان یہ ہے۔

توحید کی اِک برقِ جہندہ ہیں حسینؑ | اِلحاد کے برباد کنندہ ہیں حسینؑ
ہے ظالم و مظلوم کے انجام میں فرق | مُردہ ہے یزید اور زندہ ہیں حسینؑ

یوں راہِ وفا سے ابنِ حیدر اُٹھے
مقتل سے قیامت سی اُٹھا کر اُٹھے
کہتے ہیں کمالِ سرفروشی اِس کو
جب سجدے میں جھک گئے تو بے سر اُٹھے

سر وہ ہے جو رب کی راہ پر جھک جائے
موقع نہ ہو جھکنے کا مگر جھک جائے
جب وقتِ نماز و قتل اِک ساتھ آئے
تلوار اُٹھنے سے پہلے سر جھک جائے

تقلیدِ حسینؑ نفس کی قربانی
تائیدِ حسین راسخ الایمانی
اس سے بھی بلند اَور اِک منزل ہے
اِدراکِ صحیح عظمتِ انسانی

اِک دَور سلامی دنیا کا صدیوں میں ایسا آتا ہے
جب کوئی پیمبر اُٹھتا ہے یا کوئی شہادت پاتا ہے
تسلیم و رضا کی منزل میں ہر گام پہ لاکھوں خطرے ہیں
دریا سے آگ اُبلتی ہے، بادل شعلے برساتا ہے
مَردانِ وفا خوش ہو ہو کر تلوار کا پانی پیتے ہیں
اور زخم وہ نعمت ہے جس کو غازی ہنس ہنس کر کھاتا ہے
اَے نہرِ فرات اے نہرِ فرات افسوس کر اپنی قسمت پر
کوثر کا ساقی آج ترے ساحل سے پیاسا جاتا ہے
سجادؑ اسیرِ ظلم ہوئے افسوس کسی نے یہ نہ کہا
یہ پاؤں ستونِ کعبہ ہیں زنجیر کسے پہناتا ہے

سیمابؔ نظر آتی ہے مجھے ہر چیز اُداس اور آزردہ
فطرت غمگیں ہو جاتی ہے جب ماہِ محرّم آتا ہے

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

بغیرِ سر فروشی آدمی زندہ نہیں ہوتا
مذاقِ زندگی بے سر دیئے پیدا نہیں ہوتا
رضا و صبر کی منزل میں کافی تشنہ کاموں کو
کبھی اک قطرہ ہوتا ہے کبھی دریا نہیں ہوتا
شہیدانِ وفا ہیں بے نیازِ بندشِ ہستی
کفن ہی ان کو کب ملتا ہے جو میلا نہیں ہوتا
نمازیں اہلِ دل کی عرش کی رفعت پہ ہوتی ہیں
جبیں ہوتی ہے اُن کی خاک پر سجدہ نہیں ہوتا

اور قیادتِ عصرِ حاضر کے لئے حسینؑ کی بازگشت کی تمنا اس طرح کرتے ہیں:۔

حسینؑ اپنا لوائے حُرّیت لے کر چلے آؤ
غلامی کی تہوں میں قید ہیں آزادیاں اب تک

اسی زمانے میں حفیظ جالندھری نے "شہسوارِ کربلا" کی تصویر اس طرح پیش کی:۔

لباس ہے پھٹا ہوا، غبار میں اَٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؑ ہے نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ کون حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
اُدھر ہزار گھات ہے مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار کا حوصلہ شکست ہے

یہ بالیقین حسینؑ ہے نبیؐ کا نورِ عین ہے

دلاوری میں فرد ہے، بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنوں کا رنگ زرد ہے
حبیبِ مصطفٰےؐ یہ ہے، مجاہدِ خدا یہ ہے
جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد برد ہے
یہ بالیقین حسینؑ ہے نبیؐ کا نورِ عین ہے

اُردو اَدب میں حسینؑ اور اُن کے کارنامے سے متعلق یہ نیا شعور رُبع صدی سے پختہ ہوتا چلا آرہا تھا لیکن مرثیہ نگاری میں جوش ملیح آبادی کے علاوہ کسی شاعر کے یہاں اس کا کوئی دیرپا نقش نہ اُبھرا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مرثیہ نگار شعراء کی نظر اُردو ادب کے ترقی یافتہ دور کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ان میں کچھ قدیم طرز کے پیرو تھے جو عزلت گزیں ہو چکے تھے، بعض جو جدید تقاضوں سے خائف نہ تھے وہ عظمتِ فن سے محروم تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ادب و شعر کی بلندیوں کو چھو لینے والے حضرات مرثیے کے احیاء کی طرف متوجہ ہوتے۔ آخری دَور کے لکھنوی شعراء یعنی یگانہ، صفی، ثاقب اور عزیز نے اس طرف قطعاً توجہ نہیں کی۔ صرف انور حسین آرزو نے بعض مراثی لکھے لیکن اُن کے یہاں نئے نظریات کا اِدراک موجود نہ تھا۔ اس ادبی اہمیت کا احساس لکھنؤ میں نواب جعفر علی خاں اثر کو ہوا اور اُنھوں نے قدیم روایات اور جدید مطالبات کے امتزاج سے پچاس بند کا ایک مرثیہ تصنیف فرما دیا۔ جس میں چہرہ، رخصت، جنگ اور شہادت سب کو مختصراً نئے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ بالکل اسی زمانے میں یا اس سے کچھ قبل

لکھنؤ کے باہر بھی بعض بالغ نظر شعراء کو تجدیدِ مرثیہ کا خیال پیدا ہوا۔ ان میں پروفیسر جمیل مظہری بہت نمایاں ہیں جو مذہبی خوش عقیدگی کے ساتھ پختہ سیاسی شعور، گہرا جذبۂ اصلاح اور فنی وقوف بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ ع

عشق کیا ہے غمِ ہستی سے رہا ہو جانا

غالباً ۱۹۱۸ء میں یا اُس کے کچھ زمانے بعد لیکن جوش کے "آوازۂ حق" سے پہلے کہا تھا۔ یہ شاعر کی ابتدائی تخلیقات میں سے ہے۔ اس لیے اگر ہم اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھیں تو اُن کے اصلاحی جذبے اور فنی شعور کا شاہکار اُن کا دوسرا مرثیہ "پیمانِ وفا" ملتا ہے جو ۱۹۳۵ء میں (جارج پنجم آنجہانی کی جوبلی کے بعد) تصنیف ہوا تھا۔ بیانیہ اوصاف کا یہ مرثیہ کلاسکی بنیادوں پر جدید تفکر اور نئے اندازِ بیان کا نمونہ ہے۔ یہاں درمیانی حصے سے اس کے چند بند نقل کئے جاتے ہیں۔

کربلا وادیٔ بطحا تری قسمت کے نثار — تیرے جنگل کو بسائے ہے مدینہ کی بہار
تیرے سینے میں ہیں مدفون وہ دُرِّ شہوار — جن سے تھا عرشِ خداوندِ معظم کا سنگار
منتخب تو ہوئی تحویلِ امانت کے لئے
حق نے چھانٹا تجھے میدانِ شہادت کے لئے

تو وہ مینارِ تجلّی ہے دہ صحرائے حیات — روح کو جس کے اُجالے میں ملی راہِ نجات
کیوں نہ تو رُوئے زمیں پہ ہو رفیع الدرجات — کہ تری خاک پہ بکھرے ہیں خدا کے آیات
صدق کی، عزم کی، ایمان کی تفسیر ہے تو
خوں سے لکھی ہوئی قرآن کی تفسیر ہے تو

رسمِ قربانی حق جس سے ہوئی عام وہ خون　　　جس کا کہتی ہے فسانہ شفقِ شام وہ خون
جس کی ہر چھینٹ میں اللہ کا پیغام وہ خون　　　منتشر جس سے ہوئی دعوتِ اسلام وہ خون

جس سے تاریخِ وفا لکھ گئے غازی وہ لہو
سُرخرو جس سے ہوا دینِ حجازی وہ لہو

فخر کر فخر کر اے ارضِ معلّیٰ القاب　　　کہ تری خاک کی دولت ہے، وہ خونِ نایاب
کیوں نہ تو سجدہ گہہِ عشق ہو تا یومِ حساب　　　ہے ترے فرشِ مقدس پہ وہ آسودہ خواب

جس کی تکبیر سے اللہ کی دُنیا جاگی
اُمتِ ختمِ رُسل ملتِ بیضا جاگی

اس کے بعد جناب جمیل مظہری نے تیسرا مرثیہ ع
کھولا عروسِ شب نے جو زلفِ دراز کو

حضرت جوشؔ کے مرثیہ "حسین اور انقلاب" کی تصنیف سے پہلے کہہ لیا تھا لیکن اُن کی یہ کاوشیں اُن کی ذاتی بے اعتنائی کے باعث عام شائقینِ اَدب تک بدیر پہنچ سکیں۔ بہر حال ۱۹۴۱ء میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے "حسین وانقلاب" لکھ کر مرثیے کے قارئین اور سامعین کو امام حسینؑ کے کارنامے کی نئی تعبیروں کا پتہ دیا۔ یہ مرثیہ تصنیف و طباعت کی منزل سے گزرنے کے خاصے عرصے بعد اوّل لکھنؤ کی ایک مجلس میں پڑھا گیا اور پھر یادگارِ حسینی کے موقع پر خود صاحبِ تصنیف ہی نے اسے دوبارہ پڑھ کر سنایا۔ جوشؔ کی فکر و تخیل کی اس نئی تخلیق نے بعض دوسرے شعراء کو بھی اسی انداز میں کہنے کی ترغیب دی چنانچہ اس نوع کے چند اور مراثی بھی تصنیف ہوئے جنھیں

لکھنؤ کے سامعین نے لفظِ "مسدس" سے موسوم کیا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۶۴ء

۲

کراچی کے بعض شعراء مرثیہ میں نئے تجربات کرنے کے مدعی ہیں اور اپنی تخلیقات کو ادب العالیہ سے منسوب کرنے پر مُصر ہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ ان میں سے ایک صاحب نے اپنے نو تصنیف مرثیے میں ڈارون اور نطشے کے نظریات پر تنقید کر کے عظیم انسان کی پرکھ کا معیار قائم کیا ہے۔ انھیں میں سے ایک شاعر نے گزشتہ سال کے فرقہ وارانہ فسادات سے اپنے مرثیہ کا موضوع اخذ کر لیا تھا۔ ایک اور صاحب نے اپنے مذہب کو سچّا ثابت کرنے کے سلسلے میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ تقسیم برِصغیر کے حادثات میں اُن کی ہم عقیدہ کوئی عورت اغیار کے قبضہ میں نہیں رہی۔ ایک بزرگ نے مرثیہ پڑھنے میں تمثیل بیانی کو وقارِ منبر کے منافی ٹھہرا کر اس موضوع پر ایک مرثیہ تصنیف فرما دیا۔ کبھی یہ آواز کان میں آتی ہے کہ فلاں صاحب ہمارے آئین (Constitution) پر مرثیہ تصنیف فرما رہے ہیں۔ کبھی یہ سُنتے ہیں کہ حضرت رشید تُرابی کا ایک خطبہ مرثیہ کی صورت میں نظم کیا جا رہا ہے۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ کیا خبر یہ لوگ کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اب تک تقریباً اٹھارہ سال میں اس نئے شعور کا ترجمان مجموعۂ مراثی کوئی شائع نہیں ہوا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ مجموعہ تو درکنار

ان حضرات کا ایک مرثیہ بھی اب تک طبع نہیں ہو سکا۔ اس صورت میں کوئی کیا محاکمہ کر سکتا ہے۔ البتہ مجلس میں سُنے ہوئے کلام کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے جدید شعراء غالباً ان واقعات کی صحت کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں جن کو اُن کے اسلاف صدیوں سے صحیح سمجھتے چلے آرہے تھے۔ لہذا یہ لوگ جو سیاسی نوعیت کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں اُن سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان سیاسی نظریات و مصطلحات کو مراثی میں رواج دینے کے بعد امام حسین اور اُن کے اعزّہ و انصار اُن اوصاف کے حامل نہیں رہیں گے جن سے انھیں تیرہ سو سال سے متصف دکھایا جا رہا تھا۔ آج کے انسان کی ضرورت اور اُس کے سیاسی مسالک کے پیشِ نظر شہدائے کربلا کے عمل، اُن کے نظریات، اور اُن کی مصلحت مبنی کی ایسی تعبیریں کی جا رہی ہیں جن سے خانوادۂ نبوّت کے افراد جدید بین الاقوامی رہنماؤں کی طرح نظر آنے لگیں گے۔ اور جزیرہ نمائے عرب کا تیرہ سو سال پہلے کا انسان بالکل فراموش ہو جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی اور مذہبی اُمور میں ایسی نکتہ آرائیاں خلافِ حقیقت بھی ہیں اور غالباً منافی مذہب بھی۔

اِن مراثی میں فرقہ وارانہ نوک جھونک کے بھی خاصے مواقع نکل آتے ہیں جن کے باعث جدید مرثیہ عظیم ادب کی غیر جانبدارانہ فضا تک نہیں پہنچ سکا۔ قدیم طرز کے مراثی بالکل سیدھے سچے طریقے سے غایتِ شہادت کا اظہار کر دیتے تھے۔ جن سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی تھی اور سُننے والا مظلوم سے ہمدردی اور ظالم سے نفرت کا جذبہ لے کر مجلس سے اُٹھتا تھا لیکن اِدھر بعض دوسرے معتقدات رکھنے والے دوستوں کو کچھ شکایات پیدا ہو چلی ہیں۔

ان نقائص سے قطع نظر جب ہم محاسنِ شعری کی تلاش ان جدید مراثی میں کرتے ہیں تو ہم کو اور زیادہ مایوسی ہوتی ہے۔ اِن تخلیقات سے ادبی حلقوں کی بے خبری پتہ دیتی ہے کہ اِن نو تصنیف مراثی کا اثر ابھی تک اُن مجلسوں سے آگے نہیں بڑھ سکا جن میں یہ پڑھ کر سُنائے جاتے ہیں۔ اگر ان نئے مراثی کا کوئی مجموعہ کبھی شائع ہوا تو ان کے ادبی معائب و محاسن کا صحیح اندازہ ہو سکے گا اور یہ بھی کہا جا سکے گا کہ یہ تخلیقات کتنے عرصے تک زندہ رہ سکیں گی۔

۱۵ اگست ۱۹۶۴ء

۳

آج بعض حضرات نئے مرثیوں کی طرف زیادہ متوجہ ہیں اور پُرانے مرثیوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر ہم دونوں قسم کے مراثی کا کچھ فرق اور اُن کی اہمیت کا کچھ تذکرہ یہاں کرتے چلیں جس کے لئے تھوڑے سے تاریخی تجزیے کی ضرورت ہوگی۔ اُردو مرثیہ کی بنیاد، اس میں شک نہیں کہ محض واقعۂ کربلا پر قائم ہے جو اوّل اوّل نوحہ کی صورت میں جنوبی ہند سے شروع ہوا۔ پھر فنّی اور ادبی فروغ پاتا ہوا دکن سے پہلے دلّی اور پھر دلّی سے لکھنؤ پہنچا۔ یہاں انیسؔ و دبیرؔ نے اسے اتنی ترقی دی کہ آئندہ کسی اضافے کے امکانات محدود نظر آنے لگے۔ لکھنؤ کے اس ترقی یافتہ دورِ مرثیہ نگاری میں ادبی اور اسلوبی خوبیوں کے علاوہ جو بات امتیازی حیثیت رکھتی ہے وہ ان مراثی کے تفصیلی واقعات اور اُن واقعات کی ترتیب و تنظیم ہے دکن کے ابتدائی مراثی کی تکنیک کچھ ایسی تھی کہ علیحدہ علیحدہ ہر شعر سلام کی طرح بعض

واقعات کی طرف محض اشارہ ہوا کرتا تھا۔ تفصیل سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے بعد زمانے کے ذوق کے مطابق اُن مراثی کے اسلوب، تکنیک اور ترتیب میں تبدیلی پیدا ہوئی اور مختصر اشارات تفصیل کی صورت پانے لگے یعنی اب نوحہ وسلام کا انداز چھوٹا اور چو مصراعی بندوں میں وہی باتیں قدرے تفصیل وتسلسل کے ساتھ بیان ہونے لگیں اور کوشش اس بات کی ہوئی کہ مختلف سانحوں کی طرف محض معنی خیز اشارے کر دینے کے بجائے اُن کو پھیلا کر بیان کیا جائے۔ یعنی ہر شہید کے حال میں تفصیلی مرثیے علیٰحدہ علیٰحدہ تصنیف کیے جائیں۔ اس طرح دکن سے لکھنؤ تک مرثیے کا ارتقائی سفر گویا ایجاز سے تفصیل تک کا سفر ہے۔ جب واقعات کو مرثیے میں اتنی اہمیت حاصل ہو گئی تو ہیرو سے متعلق داخلی تاثرات کا سیلاب کچھ ٹھہرا اور خارجی تفصیلات پر زیادہ توجہ ہوئی۔ اس طرح گویا مرثیہ کی داخلی شاعری خارجی کوائف کی شاعری میں بدل گئی اور اس کے ساتھ تاثرات کا عنصر مرثیوں میں کم ہونے لگا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ محتشم کاشی کے مرثیے میں جو سوز و گداز ہے مقبل کے مراثی میں وہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن لکھنؤ کی مرثیہ گوئی کا کمال یہ ہے کہ اس نے داخلی و خارجی پہلوؤں کو اس حسن کے ساتھ ملا دیا ہے کہ وہ دونوں ایک ہو گئے۔ ان دونوں پہلوؤں کے علاوہ اُس میں قصیدے کی جزالت، غزل کا لوچ اور مثنوی کی سلاست بیانی بھی ہے۔ اِن مراثی میں رنگا رنگی کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ یعنی کہیں صبح ہے کہیں شام، کہیں گرمی ہے کہیں خنکی، کہیں میدانِ جنگ ہے کہیں خیمہ و خرگاہ، کہیں شیطان ہے کہیں فرشتہ، کہیں تپتا ہوا بیابان ہے کہیں ساحل

دریا کا دلفریب نظارہ، کہیں بجلیاں ہیں کہیں تلوار کی جھنکار۔ اور اِن فضاؤں کی تبدیلی سے کبھی حاضرین بشاش ہوجاتے ہیں کبھی افسردہ، کبھی جوش اور ولولے سے اُن کے دل گرما جاتے ہیں اور کبھی افراطِ غم سے اُن کی آنکھیں پُرنم ہوجاتی ہیں اور آوازیں گلوگیر۔ غرض انیسؔ و دبیرؔ کا مرثیہ ٹریجڈی بھی تھا اور رزمیہ نظم بھی۔ اس میں داخلی سوز بھی تھا اور خارجی ساز بھی۔ ایسی طویل بیانیہ نظموں کے پڑھنے کے لئے بھی خاص سلیقہ درکار تھا۔ اس لئے اُنھوں نے مرثیہ پڑھنے کے بھی کچھ اصول وضع کئے تاکہ اس میں ڈرامائی دلکشی بھی پیدا ہوجائے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ لمبے لمبے مکالمے یا طویل نظمیں بغیر کسی سہارے کے نہیں سُن سکتا۔ اُس کی آنکھ اگر ایک مرکز پر ٹھہری رہے تو کچھ دیر کے بعد اُکتا کر مائل بہ خواب ہوجائے گی۔ لیکن اگر اس کے سامنے حرکت و عمل کا مظاہرہ ہوگا تو پھر وہ ہر نئی جنبش کا ساتھ دینے لگے گی۔ لکھنؤ کے مرثیہ گو اس گُر سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے اُنھوں نے مراثی کی تکنیک میں عمل و حرکت کی خاص رعایتیں ملحوظ رکھیں۔ اور اِن مراثی کے پڑھنے کے بھی ایسے طریقے ایجاد کئے جو سامعین کی نگاہوں کو بھی اپنی طرف سے ہٹنے نہ دیں۔ مثلاً جب مجلس میں یہ مصرعہ تحت اللفظ پڑھا جائے گا ع

گھوڑے کے پاؤں کاٹ گئی سر سوار کا

تو ذاکر کو اپنے داہنے ہاتھ سے ایک بار نیچے کی طرف تلوار کا وار دکھانا ہوگا اور پھر وہ اوپر کی طرف ہاتھ اُٹھا کر سر کا کٹنا دکھائے گا۔ اور اس عمل کے وقت حاضرینِ مجلس کی نگاہیں اُس کے ہاتھ کی جنبشوں کے ساتھ ساتھ رہیں گی۔ نگاہوں کی یہ مشغولیت ایک طرف اور مرثیے کے مناظر کی رنگارنگی دوسری طرف سامعین کی توجہ کے

جذب کا بڑا سبب ہوتی ہے اور اُس پر مرثیہ کا شعری جمال بھی اگر مہیا ہو جائے تو پوری مجلس ہمّالِ کارتک ایک معجزۂ تاثیر بن جاتی ہے۔ لکھنوی اسکول کے وہ مراثی جو انیس و دبیر اور اُن کے معاصرین و مُقلّدین نے ان مجلسی رعایتوں کو نظر میں رکھ کر تصنیف کئے تھے آج بھی جب خاص التزام کے ساتھ پڑھ دیئے جاتے ہیں تو حاضرینِ مجلس گھنٹوں محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔

ان بیانیہ مراثی کی تکنیک، ترتیب، رنگارنگی، شگفتگی اور سوز و گداز پر انیس و دبیر کے بعد جب کوئی ترقی نہ ہو سکی تو مرثیہ نگاری میں زوال شروع ہو گیا اور اس کے مقابلے میں روضہ خوانی واعظانہ خطابت کے رنگ میں سامنے آئی اور علماء و مقررین کے خطبات نے مراثی کی جگہ لے لی۔ ان واعظین کا ایک معینہ اسلوبِ بیان ہے۔ وہ پہلے کلامِ پاک کی کوئی آیت پڑھتے ہیں اور مفسرانہ نکات بیان کر کے مسائلِ حق و باطل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں اسلامی تاریخ کے واقعات پر محاکمہ بھی ہوتا ہے۔ پھر یہی سلسلۂ بیان حادثۂ کربلا تک پہنچ جاتا ہے۔ آخر میں کسی غم انگیز سانحے پر مجلس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ مرثیہ نگار شعراء کے پاس اس ایجاد کا بظاہر کوئی جواب نہ تھا اس لئے تقریباً رُبع صدی تک قدیم مرثیہ انحطاط کے عالم میں رہا۔ بالآخر نئے علوم، نئے سیاسی اور بین الاقوامی خیالات اور شاعری کے نئے نظریات نے شعراء کو ایک نئے راستے کا سُراغ دیا جو ہر چند کٹھن اور محدود ہے لیکن اس میں وسعت و گنجائش یقیناً زیادہ ہے۔

نئے تبلیغی انداز کے مرثیے تقسیمِ برِصغیر سے قبل ہی چند شعراء نے تصنیف کرنا شروع کر دیئے تھے اور آج بھی وہ پسند کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کوشش

مرثیے کو زندہ نہیں رکھ سکتیں۔ کیونکہ نئے شعراء نے عموماً مرثیے کے بیانیہ وصف اور ڈرامائی دلکشی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اب نہ بیانِ واقعات میں حرکت و عمل کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ اُس کے پڑھنے میں کوئی حُسن اُبھارا جاتا ہے۔ سارا مرثیہ اوّل سے آخر تک ایک ہی ساز و آہنگ میں چلتا ہے۔ اس میں ہیرو کے شخصی محاسن قصیدے کے طور پر سلسلہ وار بیان کر دیئے جاتے ہیں جن میں تنوع کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نقص پیدا ہوتا ہے کہ ایک شاعر کسی شہید کے حال میں صرف ایک ہی مرثیہ لکھ سکتا ہے۔ اگر وہ اُسی شہید کے حال میں کوئی دوسری سعی کرے گا تو پھر اُنھیں بیان کردہ اوصاف کا اعادہ ہونے لگے گا اور لوگ سُنی ہوئی باتوں کو دوبارہ سُننا پسند نہ کریں گے۔ حاضرینِ مجلس کی طبیعتیں رفتہ رفتہ مرثیے سے اُکتانے لگیں گی اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مرثیہ کا وہ بیانیہ انداز پھر سے بحال کرایا جائے جس نے اُردو مرثیہ کو دوسری اسلامی زبانوں کے مراثی کے مقابلے میں ممتاز حیثیت دلا دی تھی۔

۸ر جولائی ۱۹۶۲ء

۴

کہا جاتا ہے کہ قدیم مرثیے کے بعض اجزاء اور موضوعات پر آج تک جتنے اعتراضات ہوئے تھے جدید مرثیہ اُن سب سے پاک ہے کیونکہ مناظر کا خلافِ واقعہ بیان،

گھوڑے اور تلوار کی مبالغہ آمیز تعریفیں، ساقی نامے کی بے اعتدالیاں، خواتین کے اضطراب و اضطرار وغیرہ کے بیانات اس میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن جدید مرثیہ آج جن چیزوں کو پیش کر رہا ہے وہ تو طرزِ انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی میں بھی موجود ہیں یعنی امام اور اُن کے اعزّہ و انصار کی سیرتیں، دنیاوی مصائب کا مقابلہ، حق و باطل کا فرق، صبر و ایثار کے جوہر، شجاعت و استقلال کے نمونے، شہادت کی اہمیت، واقعات کی تنقید اور اُن کی نفسیاتی تحلیل، شہادت کو امرِ حق کے مظاہرے کا عظیم الشان کارنامہ سمجھنا، جس میں ایک اصول کی حمایت میں مردانہ وار سب کچھ لُٹا دیا گیا، یہ سب ایسے مضامین ہیں جنھیں جدید مرثیہ ذرا شعوری طور پر اپنے زمانے کے مخصوص استدلالی انداز میں پیش کرتا ہے اور قدیم مرثیہ غیر شعوری طور پر ان باتوں کی طرف صرف اشارے کر دیتا تھا لیکن نظریہ دونوں کا ایک ہے یعنی تبلیغ واقعاتِ حسین اور بلاشبہ یہ تبلیغ جتنی طرزِ انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی نے کی اتنی ابھی تک اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکی۔ مقرر کی تقریر ایک مخصوص جماعت ہی سنتی ہے لیکن انیسؔ و دبیرؔ کا مرثیہ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو، سکھ، پارسی اور عیسائی ہر قوم کے افراد نے سنا اور پڑھا اور اتنا سمجھا کہ اُنھیں تاریخِ اسلام کے اور کسی فرد کا نام یاد آئے یا نہ آئے لیکن حسینؑ کا نام وہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ بہر حال قدیم اور جدید مراثی کے عنوانات اور موضوعات قریب قریب ایک ہی ہیں۔ لیکن قدیم مرثیہ بہت سی ایسی وسعتیں بھی رکھتا تھا جن کا موجودہ مرثیے میں فقدان ہے۔ ان میں سے بعض باتیں تو دانستہ چھوڑ دی گئیں مثلاً بہارِ صبح، ساقی نامہ وغیرہ لیکن بعض کو مجبوراً

چھوڑ دینا پڑا (مثلاً رزمیہ اور اُس کے دیگر لوازم) کیونکہ اُن کے بیان کی موجودہ شعراء میں صلاحیت نہ تھی۔ بہر حال جدید مرثیہ کی اصلاحی کوشش کتنی ہی اہم سہی لیکن وہ ہے ایک طرح کا اعترافِ شکست ہی۔ کیونکہ انیسؔ نے رزمیہ گوئی اور کرداروں کے تجزیہ کو جس معیار پر پہنچا دیا تھا وہاں تک پہنچنے کے لئے نہ تو ان لوگوں میں وسعتِ معلومات اور وسعتِ تخیئل ہے اور نہ قادر الکلامی اس لئے انھوں نے زیادہ سہل راستہ تلاش کر لیا لیکن اگر جدید مرثیہ کو ادبی کارناموں کی صفِ اوّل میں آنا ہے تو ابھی انیسؔ کے مرثیے سے بہت کچھ سیکھنا پڑے گا۔ ورنہ وہ صرف اپنے ماحول کا آئینہ دار ہو کر رہ جائے گا اور اس کی شاعری تمام تر ہنگامی ہو گی جس کے مضامین کا تنوع دس بیس تصانیف کے بعد ختم ہو جائے گا۔ آپ لاکھ کہئے کہ رزمیہ اس زمانے کا مذاق نہیں لیکن آپ شہدائے کربلا کی سیرت پیش کر رہے ہیں۔ شجاعت جن کی فطرت تھی اور جن کا نام تلواروں کی جھنکار کے ساتھ یاد آتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ رزمیہ گوئی سے غضِ بصر کیا جائے۔ حفیظ جالندھری نے بھی تو شاہنامۂ اسلام جدید زمانے ہی میں لکھا ہے اور جدید تاثرات سے متاثر ہونے کے بعد لکھا ہے۔ لیکن تلوار کا استعمال کسی معرکے کے بیان میں ترک نہیں کیا کیونکہ جن مجاہدوں کے واقعات پیش کئے جا رہے تھے اُن کا تصوّر ہی بغیر تلوار کے مکمل نہ ہوتا۔ وہ بیسویں صدی کی پیدائش نہیں تھے بلکہ تیرہ سو سال قبل کے لوگ تھے۔ اُن کے کارنامے انھیں کی دنیا میں پہنچ کر دیکھے جا سکتے ہیں۔ شاعر یا ادیب کا کام یہ نہیں کہ وہ اپنے ہیرو کو اپنی دنیا میں کھینچ لائے یا اپنے زمانے کے لوگوں سے ہم آہنگ کر کے دکھائے

آپ کو مرثیہ کہتے وقت واقعاتِ کربلا اور عربی زندگی کی فضا میں اتنا کھو جانا چاہئے کہ مرثیہ پڑھتے وقت محسوس ہونے لگے آپ بھی اپنے ہیرو کے ساتھ میدانِ کربلا کے کسی گوشے میں کھڑے یہ تمام واقعات دیکھ آئے ہیں۔

جدید مرثیہ چونکہ ابھی اپنا راستہ متعین نہیں کر سکا اس لئے بہت سی خامیاں اس میں نظر آتی ہیں۔ کسی خاص روئیداد کے تحت بیان کو اُٹھانا اور واقعات کی ترتیب و تنظیم ایک خاص ربط و تسلسل کے ساتھ کرنا اس میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہر بند کا ہر مصرعہ امامِ حسینؑ کی ایک مخصوص صفت کی طرف تو ضرور اشارہ کر دیتا ہے لیکن اس کے آگے کچھ نہیں۔ اس میں نہ سیرت نگاری کے اچھے نمونے ہیں اور نہ واقعات کی مکمل شاعرانہ تصویریں۔ جدید مرثیہ صرف امام حسینؑ سے متعلق ہوتا ہے کیونکہ امام میں اتنے محاسن موجود ہیں کہ انھیں ہر بڑی سے بڑی تفصیل کے ساتھ آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب جدید مرثیہ نگار دوسرے شہدار کا حال لکھیں گے تو انھیں بڑی وسیع فکر و نظر سے کام لینا پڑے گا، تاریخ کے اوراق اُلٹنے پڑیں گے اور صرف یہی نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا، عہدِ یزید کی سیاست کو زمانۂ حال کے نظریوں سے ٹکرا کر تنقید کرنی پڑے گی اور یہ وہ مراحل ہیں جن سے بآسانی گزرنا ہر شخص کا کام نہیں۔

بہر حال جہاں تک فنِ شعر، وسعتِ تخیل اور آرٹ کا تعلق ہے جدید مرثیہ عہدِ انیسؔ کے مراثی سے بہت پیچھے ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدید مرثیہ ادبی اہمیت کے لحاظ سے مراثی انیسؔ تو خیر دُور رہے، اُن کے مقلدین

کے سامنے بھی نہیں پیش کیا جاسکتا۔

آئندہ امکانات

آج زمانہ فکرونظر اور رُجحان و خیال کی ایک نئی منزل سے گزر رہا ہے۔ قدیم زمانے میں جو چیزیں لوگوں کی روحوں کو ہلا دیتی تھیں اور دل و دماغ میں ہلچل پیدا کر دیتی تھیں آج ہم اُن کی صرف اس لئے قدر کرتے ہیں کہ آثارِ ماضی بہر حال ہر دلعزیز اور مقدس ہوتے ہیں۔ دَورِ ملوکیت اپنی پُرشکوہ روایات کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب و تجدّد کا زمانہ ہے۔ انسانیت، سامراج اور شخصیت پرستی کی وادیوں سے گزر کر انسانی حقوق، جمہوریت اور انقلاب کی حدود تک جا پہنچی ہے۔ ہم نے مشاہیر کی عظمت کے جو پیمانے بنا رکھے تھے یعنی حسب نسب، اقتدار و اقبال، حشمت و شکوہ اور دولت و امارت وغیرہ وہ پیمانے اب ٹوٹ چکے ہیں۔ انسانی عظمت کا معیار بدل رہا ہے۔ اب نوعِ انسانی کا آئیڈیل تاجدار نہیں مزدور ہے۔ اس لئے اب سے پچاس برس قبل ہمارے مرثیہ نگار حسینؑ کی شخصیت کو جس انداز سے پیش کرتے تھے اب وہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ حسینی شہادت اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ اس واقعہ کے تمام انقلابی ممکنات کو پیشِ نظر رکھ کر ہر عہد میں نئی نئی خیال آرائیاں ہوتی رہیں گی۔

آج حسینؑ صرف مسلمانوں کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ وہ ایک بین الاقوامی ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے حسینؑ اور عظمتِ حسینؑ پر محدود مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ تاریخی، سیاسی اور تمدنی روشنی میں غور کرنا اَمرِ ضروری ہے۔ عہدِ ماضی

کے مرثیہ گو صرف روایات اور منقولات کے دائرے میں چکر کاٹتے تھے اور نقل و روایات میں اپنے شاعرانہ تخیل سے رنگ بھر کر سننے والوں کو مسحور و متاثر کر دیتے تھے اور یہی اُن کی تمام کاوشوں کا ماحصل تھا مگر جدید مرثیہ حسینی پیغام کا مطالعہ موجودہ نظریۂ انسانیت کی روشنی میں کرے گا۔ حسینؑ نے خدمتِ خلق، ایثار، اُخوت، مساوات، سرفروشی، ثبات و استقلال اور حرّیت و آزادی کا جو غیر فانی پیغام دیا ہے، جدید شاعر اُس پیغام میں اسلامی صداقتوں کا رنگ بھر کر ہر نسل، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر عقیدے کے انسان کے رُوبرو رکھ کر انھیں حسینیت کی طرف دعوت دے گا اور بتائے گا کہ کمیونزم، پارلیمنٹری ازم، اور نیشنلزم وغیرہ میں انسانوں کی نجات نہیں بلکہ انسانی نجات حسینیت میں پنہاں ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ نئے اُبھرنے والے مرثیہ گو اپنے زمانے کی بڑھتی ہوئی عقلیت سے مرعوب ہو کر حسینؑ کی روحانی تعلیم پر کہیں پردہ نہ ڈال دیں۔

حسینؑ جانِ مذہب اور روحِ دین ہیں۔ آپ بڑی سے بڑی مذہبی عظمت اور دینی تقدس کو حسینؑ کی شخصیت کے ساتھ فخر سے وابستہ کر سکتے ہیں مگر نئے عہد کے مرثیہ گو کو یہ جان لینا چاہئے کہ مذہبی اپیل کا اثر صرف ایک مخصوص جماعت پر ہو سکتا ہے اور حسینؑ کو کسی خاص مذہب کے دائرے، کسی خاص عقیدے کے حصار اور کسی خاص نظریے سے منسوب رکھنا حسین کے پیغام کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا۔

جہاں تک تبلیغ کا تعلق ہے، مرثیے نے حسینی کارناموں کی تبلیغ یقیناً اپنی بساط سے بہت زیادہ کی لیکن محض غیر شعوری طور پر۔ جدید مرثیہ اب تبلیغ کو اپنے

مقصد کا ضروری جز و سمجھ کر آگے بڑھ رہا ہے اور نئے شعرا انھیں تبلیغی ولولوں سے معمور ہیں۔ وہ مرثیے میں اس فن کا ایک نیا مستقبل بنا رہے ہیں ایک ایسا مستقبل جو محمدؐ و آل محمدؐ کی معاشرت، معیشت، سیاست تمدن اور انقلابی روح کو بڑے جوش و خروش اور بڑی آن بان کے ساتھ پیش کرے گا۔ واقعۂ کربلا کا تاریخی، تمدنی، سیاسی اور انسانی پس منظر سامنے لائے گا۔ اور حسینؑ کی شخصیتِ کبریٰ کے ہر ہر پہلو کو نمایاں کر کے انسانیت کی نئی راہ کا نشان دے گا۔

اہلبیت کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟ انھوں نے اُمتِ اسلام اور اُمتِ اِسلام کے توسط سے عالمِ انسانیت کے سامنے کیا کیا مقاصد رکھے؟ اسلامی تاریخ کی رفتار پر اُنھوں نے کیا اثر ڈالا؟ موجودہ زمانے میں اقوام و ملل جن جن اخلاقی مصائب میں گرفتار ہیں حسینی تعلیم نے اُن کا کیا مداوا پیش کیا؟ اور بنی نوعِ انسان کے تعمیری ارتقار کے راز کن کن باتوں میں مضمر ہیں؟ یہ ہیں وہ عنوانات جن کو سامنے رکھ کر مرثیہ کو آگے بڑھانا ہے لیکن اس کی تکمیل غالباً آگے چل کر ہوگی۔ جدید مرثیہ میں آہستہ آہستہ جو انقلابی عناصر شامل ہو رہے ہیں وہ آنے والے زمانے میں زیادہ صحیح طور پر اُبھریں گے اور صنفِ مرثیہ ادب اُردو کی ایسی رنگا رنگ صنف بن جائے گی جو اخلاقیات، اصولِ انسانی، تمدن، تہذیب اور عقائد و نظریات کے لازوال خزانے سے معمور ہوگی اور یہ تمام تصانیف مذہبی ادبی دونوں نقطۂ نظر سے مقبول ہونگی لیکن اگر مرثیہ گو اس بوجھ کو نہ سنبھال سکے تو مرثیہ باوجود اپنے تمام فطری محاسن کے، بہت جلد قومی نظم ہو کر رہ جائے گا۔

پہلی مجلس

گیارہ بجے دن

۲۹ جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

حسینیۂ ایرانیان۔ کراچی

جب میں پہنچا ہوں تو حسینیۂ ایرانیان کا ہال تقریباً بھر چکا تھا۔ صفدر صاحب منبر پر بیٹھ چکے تھے۔ کراچی میں اُن کی یہ پہلی مجلس تھی۔ وہ کلاسکی رنگ کے کسی مرثیہ گو کا مرثیہ پڑھنے والے تھے۔ میں صفدر صاحب کو بعض نجی صحبتوں میں اس سے پہلے بھی پڑھتے سُن چکا تھا۔ اُنھوں نے اپنی نظمیں بھی سُنائی تھیں اور مرثیوں کے چند بند بھی۔ نظمیں پڑھتے وقت صفدر صاحب اپنی نظموں کے تاثر کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے۔ اُن کا لب ولہجہ، اُن کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات، اُن کی آنکھوں اور اُن کے ہاتھوں کی پُرمعنی جنبش، اُن کے مصرعوں کی معنویت کو سامع کے سامنے ایک متحرک تصویر کی طرح پیش کرتی

جاتی۔ اُن کی زبان کہیں اُلجھتی نہیں تھی، کہیں رُکتی نہیں تھی۔ اُن کی آواز کہیں سرگوشی میں بدل جاتی اور کہیں "اعلان" کرتی ہوئی معلوم ہوتی ــــ پڑھنے کا یہ انداز نظموں کی چھُپی ہوئی کیفیت کو اُبھار کر دل نشین کر دیتا ــــ اور سُننے والا محویت اور حیرت کے عالم میں اُن کی نظموں کے تاثر میں گُم ہو جاتا ــــــــ چنانچہ جب وہ منبر پر بیٹھ گئے۔ تو میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیں وہ مجلس کی مرثیہ خوانی سے کیسے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ چھوٹی نظمیں پڑھ لینا یا دوستوں میں بیٹھ کر مرثیوں کے چند بند سُنا دینا اور بات ہے اور ایک بڑی مجلس میں دو ڈھائی گھنٹے مرثیہ خوانی اور بات ہے ــــ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ صفدر صاحب کے پڑھنے میں جو قدیم و جدید انداز کا امتزاج ہے کیا وہ مرثیہ خوانی کی مجلس میں بھی کامیاب ہو سکے گا۔ کیا وہ اس ڈرامائی تاثر کو سامعین تک پہنچا سکیں گے جو وہ اپنی نظموں کو پڑھتے وقت پیدا کر دیتے ہیں۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ صفدر صاحب نے چند رباعیات پڑھیں جس پہ مجلس کے بعض گوشوں سے داد کا شور اُٹھا۔ پھر وہ سلام پڑھے۔ اس دفعہ تحسین و آفرین پہلے سے کچھ زیادہ تھی۔ سلام کے بعد اُنھوں نے مرثیہ شروع کیا۔ ابتدائی چند بند تک تو مجلس کچھ سکوت اور کچھ تعریف کی درمیانی راہ سے گزرتی رہی۔ مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے سکوت تعریف میں بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ چہرے کے اختتام تک پوری مجلس سے واہ واہ کا شور پھوٹ پڑا ــــ اب مرثیہ اپنے رنگ پر آچکا تھا اور مرثیہ خواں بھی پورے اعتماد کے ساتھ مرثیہ

خوانی کی کٹھن منزلوں سے گذر رہا تھا۔ صفدر صاحب کی آواز کا اُتار چڑھاؤ، اُن کی آنکھیں، اُن کے ہاتھ اور اُن کا پورا جسم ایک تصویر بن گیا تھا ـــــ جدھر اُن کی نگاہ اُٹھ جاتی مجلس واہ واہ، سبحان اللہ سے گونج اُٹھتی ـــــ صفدر صاحب تیز پڑھنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ ہر مصرعے کو جم کر پڑھتے ہیں اور بند کے آخر تک پہنچتے پہنچتے اُن کا لہجہ ایک مکمل تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اُن کی آواز پاٹ دار ہے جو مائیکروفون کے بغیر بھی دور تک پہنچ سکتی ہے۔ صفدر صاحب کی آواز اور اُن کی شخصیت نے مرثیے کو ایک ایسے ڈرامے میں تبدیل کر دیا تھا جس میں ہر کردار تیزی سے حرکت کرتا نظر آتا تھا۔ کبھی رزمیہ مناظر نظروں سے گزرتے، کبھی المیہ ـــــ ایک ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ ہر شخص یہی محسوس کر رہا تھا کہ وہ خود مرثیہ کی فضا میں اُس کے مخصوص کرداروں کے ساتھ سانس لے رہا ہے اور اس عظیم ڈرامے کا ایک جزو ہے۔ صفدر صاحب پڑھتے رہے، مجلس سے تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ سامعین وجد میں تھے اور خود مرثیہ خواں اپنے فن کے جادو میں کھویا ہوا تھا۔ پوری مجلس اُس کے قابو میں تھی۔ کبھی رُلا دیتا، کبھی ہنسا دیتا۔ یہاں تک کہ دو ڈھائی گھنٹے گزر گئے اور صفدر صاحب نے مرثیہ ختم کیا۔ لیکن سُننے والوں کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اِتنا وقت گذر گیا ہے۔ اُن کی تشنگی اب بھی باقی تھی۔

ایسی یادگار مجلس اور ایسا پڑھنے والا سامعین نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ صفدر صاحب نے کراچی میں مرثیہ پڑھ کر مرثیہ خوانی کے فن کی طرف جو توجہ دلائی ہے وہ بہت ہی ضروری تھی۔ آج اس مجلس کو تین سال ہو گئے ہیں لیکن اس کی یاد لوگوں کے دِلوں سے محو نہیں ہوئی ہے اور شاید اسی کی بدولت مرثیہ خوانی کے فن کی

طرف بھی توجہ بڑھ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صفدر صاحب نے یہ بڑا کام کیا ہے جس سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ صفدر صاحب نے مرثیہ خوانی کا ایک نیا معیار قائم کر دیا جس میں جدید و قدیم دونوں رنگ کا امتزاج ہے۔ یہ صفدر صاحب کا منفرد رنگ ہے۔ جس میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں ہے۔

سید مجتبیٰ حسین

۸ر اکتوبر ۱۹۶۴ء

کراچی

دوسری مجلس

۸ بجے شام

۴ر اگست ۱۹۶۳ء

شاہِ کربلا۔ رضویہ کالونی

کراچی

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر ہے۔

حُسن کے باب میں اکبرؔ کی سند ٹھیک نہیں
یہ تو ہر اک بُتِ کمسن کو پری کہتے ہیں

مگر میں حُسنِ صورت، حسنِ سیرت، حُسنِ صوت اور حُسنِ ادا یعنی "حُسن" کے تمام

مظاہر کے بارے میں صرف جذباتی رائے نہیں رکھتا بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ بہ اعتدالِ عقل و ہوش اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ میں اظہارِ رائے کے معاملے میں بڑا محتاط ہوں۔ کسی چیز کے حُسن و قبح کے بارے میں سرسری طور پر رائے کا اظہار میرے نزدیک اخلاقی جرم ہے۔

میری مَسیں بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں، اُس زمانے میں حضرتِ انیس کے پوتے جناب دولھا صاحب عروج کو میں نے مرثیہ پڑھتے سُنا ہے ایک بار نہیں کئی بار۔ اِس واقعے کو چالیس[۴۰] سال سے کچھ اوپر مدت ہونے کو آئی — اور پھر اتنے طویل زمانے بعد کراچی میں ڈاکٹر سید صفدر حسین کی زبان سے مرثیہ سُن کر نہ صرف یہ کہ دولھا صاحب عروج کی یاد تازہ ہوگئی بلکہ ایک نہ بھولنے والا منظر نگاہوں کے سامنے کھنچ گیا۔

بہت سے بہت ایک مہینہ ہوا ہوگا، رضویہ کالونی کے امام باڑے میں ڈاکٹر صفدر حسین نے میر نفیس کا مرثیہ پڑھا، اور اِس سج دھج سے پڑھا کہ تمام سننے والوں کو اپنا گرویدہ اور مشتاق بنالیا۔ سُنا ہے کہ میر انیس قدِ آدم آئینوں کے سامنے مرثیہ پڑھنے کی مشق کیا کرتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی مرثیہ خوانی کی اسی طرح مشق کی ہو۔ ظاہر ہے کہ پہلے سے کی ہوئی مشق کے بغیر کوئی شخص اِس حُسن و خوبی کے ساتھ مرثیہ پڑھ ہی نہیں سکتا۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے مرثیہ پڑھنے کی سب سے بڑی خوبی اُن کا لب و لہجہ ہے۔ پڑھنے میں کوئی لفظ دبنے نہیں پاتا۔ صحیح تلفظ، لفظوں کی معنوی رعایتوں

کے ساتھ! اس پر اُن کی شیریں دہنی اور خوش مقالی، خوش لباس، ناک نقشہ دل کش، گداز بدن، سرو قامت۔ اتنی بہت سی دلکشیاں جہاں جمع ہو جائیں وہاں "احسنت و مرحبا" کے نغمے گونجنے ہی چاہئیں۔ وہ جب مرثیہ پڑھ رہے تھے تو سارا مجمع اُن کی مٹھی میں تھا۔ جہاں چاہا رلا دیا، اور جہاں چاہا ہنسا دیا۔ "سحرِ حلال" اسی کا نام ہے۔

اہل بیتِ کرام کی مدح و منقبت کے وقت اُن کے رخساروں پر عقیدت کے پھول کھلتے نظر آئے۔ ادب و احترام کی تصویر بنے ہوئے جیسے وہ نجف و کربلا کی بارگاہوں میں نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ گھوڑے کی سواری کو اس طرح دکھایا، جیسے وہ سچ مچ رزم گاہ میں اشہبِ صبا رفتار کو مہمیز دے رہے ہیں، اُن کے پاؤں منبر پر نہیں رکابوں میں ہیں، اور وہ دونوں ہاتھوں سے گھوڑے کی باگیں سنبھالے ہوئے ہیں! آستین اُلٹ کر جو تلوار کی کاٹ دکھائی ہے تو میدانِ جنگ میں تیغ زنی کا منظر کھینچ دیا۔ ایک بار پنجہ کو اس طرح مڑوڑا کہ میں تو چونک پڑا کہ اُن کے پہنچے میں چوٹ تو نہیں آگئی! فوجِ یزید کی جو ہلچل دکھائی ہے۔ وہ سماں اور منظر کشی تو شاید میں بھول ہی نہیں سکتا۔ منبر سچ مچ رزم گاہ نظر آتا تھا۔ حضرتِ عون و محمد کا وہ اسد اللّٰہی حملہ، اُن کی وہ تیغ زنی، فوج کے میمنہ، میسرہ اور قلب میں وہ اُن کی رزم آرائی، اس کے بعد ڈاکٹر صفدر نے یہ مصرعہ پڑھا۔

چلے چلو انھیں کوفے تلک بھگائے ہوئے

تو

نہ پوچھیے کہ نگاہوں سے کیا دیکھا، جیسے سچ مچ کربلا کے میدان میں گرد اڑ رہی ہے

اور یزید کی فوج بدحواسی کی حالت میں بھاگی چلی جارہی ہے۔

ڈاکٹر صفدر فنِ تمثیل و اداکاری سے فطری مناسبت رکھتے ہیں اور مرثیہ خوانی میں اُن کو میں سب سے بڑا "مُمثّل" سمجھتا ہوں اور اپنی اِس رائے کی صحت و اَصابت پر مجھے اِصرار ہے۔ جو کوئی ڈاکٹر صاحب موصوف کو ایک بار مرثیہ پڑھتے سُن لے گا وہ بار بار سُننے کی تمنا کرے گا۔

ماہر القادری

مطبوعہ ماہنامہ مشرق۔ کراچی
شمارہ اکتوبر ۱۹۶۳ء

تیسری مجلس

چار بجے شام

۲۸ جون ۱۹۶۴ء

دولت کدہ ڈاکٹر سید باور عباس۔ فردوس کالونی
کراچی

ڈاکٹر باور عباس کے یہاں ۲۸ جون ۱۹۶۴ء کو ڈاکٹر صفدر حسین نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی پُرانی روایات کو جدید دور میں ایک نئی نوعیت دی۔ میرا خیال تھا کہ مرثیے مجلس ہی کے لئے لکھے گئے، اُن کو مجلس سے جدا کر کے پڑھنا

اُن کی کیفیت کو بہت کچھ اسی طرح کم کر دیتا ہے جیسے کہ ڈرامے کی کیفیت اسٹیج سے الگ ہو کر کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میرے بچپن میں لکھنؤ میں میر انیس کے پوتے میر خورشید حسن عروج عرف دولہا صاحب کی مجلسیں جن میں وہ اپنے نو تصنیف مرثیے حسنِ ادا کے ساتھ پڑھتے تھے بڑی مقبول ہوا کرتی تھیں۔ کافی عرصے بعد راجہ صاحب محمود آباد اپنے یہاں کی مجلس میں اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھنے لگے۔ اُن کی خوانندگی کے متعلق مسعود حسن رضوی صدر شعبۂ اُردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کی یہ رائے تھی کہ "اِس وقت مرثیہ خوانی کے فن کا اگر کوئی کامل ہے تو راجہ صاحب محمود آباد"۔ وہ دن اب برسوں دور نکل چکے تھے اور کراچی کے ماحول میں مجالسِ عزا حضرت رشید تُرابی کے وعظوں اور تقریروں پر مبنی رہ گئی تھیں کہ یکایک ڈاکٹر صفدر حسین نے اِس سکوت کو توڑا۔ اُنکی مجلس کراچی میں پُرانی روایات کا نیا آغاز تو نہ تھی۔ کیونکہ کئی سال پہلے یہ آغاز ہو چکا تھا اور سید آلِ رضا اس سلسلے میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ اور خود ڈاکٹر صفدر حسین بھی اب سے دو سال قبل نئی آن بان کے ساتھ مرثیہ خوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہلی مجلس ۲۹ جولائی ۱۹۶۲ء کو حسینیۂ ایرانیان میں اور پھر ایک سال بعد دوسری مجلس ۴ اگست ۱۹۶۳ء کو رضویہ کالونی میں پڑھی تھی۔ لیکن اس بار وہ حسنِ تحت اللفظ خوانی کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگار کی حیثیت سے بھی پیش ہو رہے تھے اس لیے یہ مجلس اپنی نوعیت میں اُن کی گزشتہ مجالس سے مختلف تھی۔ بعض وجوہ سے اس مجلس میں میری بھی رسائی ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ منبر کی جگہ ایک اُونچا تخت تھا جس پر کرسی رکھ دی گئی تھی اور اُس

کے سامنے لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صفدر پرانے مرثیہ خوانوں کی طرح مگر مختلف انداز میں تشریف لائے۔ اُس چوگوشیہ ٹوپی کی جگہ جس کو میر انیس آئینے کے سامنے گھنٹوں درست کیا کرتے تھے۔ اُن کے سر پر اونچی باڑھ کی مخملی ٹوپی تھی جو اُن کے وطن کا پتہ دیتی تھی اور کج انداز میں سر پر جمی ہوئی تھی۔ انگرکھے کے بجائے وہ جدید ترین کٹ کی سفید شیروانی پہنے تھے۔ مرثیہ خوانوں کے عام طریقے پر پہلے اُنھوں نے کُرسی پر ہاتھ رکھ کر دعا پڑھی اور پھر شان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سیاہ کپڑے کے بستے کے بجائے اُن کے ہاتھ میں چمڑے کا جدید زپ دار بک کیس تھا جس میں سے اُنھوں نے مرثیہ نکالا۔ اُن کے ہاتھ میں مرثیہ کا مسودہ بالکل اتنا ہی لمبا چوڑا نظر آرہا تھا جیسا کہ مرثیہ خوانوں کا ہوتا تھا۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ اس مرثیہ کے شروع کے بند چھوڑ دیئے گئے ہیں کیونکہ ان میں متنازعہ فیہ مسائل ہیں۔ یہ اعلان ہی اس بات کا احساس دلاتا تھا کہ مجلس کی قدیم روایت میں مرثیہ خوان کچھ تبدیلی لارہا ہے۔

غرض صفدر صاحب نے بند پیش کیا۔ پہلے دو مصرعوں سے مجلس گرمائی اور تیسرے مصرعے پر پھڑک اُٹھی۔ مصرعہ تھا۔

پیکر خاک میں حیدر کی دُعا تھے عباس

اس کو ادا کرنے کے لئے اُنھوں نے دونوں ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھائے اور ہمہ تن دُعا بن گئے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ مصرعے کا معنوی زور ایک طرف اور جس اشارے سے اُسے ادا کیا گیا تھا وہ دوسری طرف ایک دوسرے سے مل کر اس طرح ہم آہنگ تھا کہ مرثیہ خوانی اپنے کمال پر نظر

آرہی تھی۔ اس بند کی بیت میں مدحِ جنابِ عباس اس نوعیت سے کی گئی تھی کہ ایک نیا عالم نظر آنے لگا۔

اہلِ حق اِن کو زعیم الشہداء کہتے ہیں
اِن کے اخلاص کو معیارِ وفا کہتے ہیں

اِس بند کے بعد ہی یہ محسوس ہو گیا کہ مرثیہ بھی نہایت عمدہ ہے اور مرثیہ خوانی بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ چنانچہ مجلس مرثیہ خوان کے اشاروں پر چلنے لگی۔

مدحِ حضرتِ عباس کے بند کے بند آنے لگے۔ ہر ہر مصرعہ کی تعریف ہوئی۔ مکرّر اور سہ کرّر پڑھوایا گیا۔ مخصوص انداز سے ادا کرنے کے بعد صفدر صاحب سیدھے سیدھے طریقے پر بھی مصرعے دوہراتے اور لوگ ادا سے زیادہ شاعرانہ تاثر سے محظوظ ہوتے۔ تمام بندوں کی بیتیں خاص طور سے مقبول ہوئیں۔ جن جن ٹیپوں پر مجلس اُچھل اُچھل پڑی اُن میں سے چند یہ ہیں۔

جذبۂ شیرِ خداؑ قوتِ ایمانِ حسینؑ
ایک جا زورِ علیؑ، حُسنِ حسنؑ، شانِ حسینؑ

یہ وہ پانی کہ شجاعت کا ہے قلزم جس سے
ہوا دو لاکھ کے لشکر میں تلاطم جس سے

فیضِ شبیر سے ذرّے میں دمک آنے لگی
غنچہ چٹکا گلِ زہرا کی مہک آنے لگی

پھر وہ اس کمال کے بند پر آئے اور اس کو کمال کے ساتھ ادا کیا۔

ہوئے پیدا تو کھُلی گود میں شبیر کی آنکھ
عمر بھر دیکھی اسی صاحبِ توقیر کی آنکھ
ہر بُنِ مو سے نمایاں ہوئی تنویر کی آنکھ
آنکھ وہ آنکھ کہ کہئے جسے تاثیر کی آنکھ
عارضِ سبطِ پیمبر کی ضیا کو دیکھا
آنکھ کچھ اور کھُلی جب تو خدا کو دیکھا

اس بند میں آنکھ کی ردیف اور آخری مصرعہ میں آنکھ کے لفظ کو جس طرح صفدر صاحب نے آنکھوں سے ادا کیا وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

مدح کے بعد دربارِ ولید کا مختصر حال آیا اور اس میں یہ ٹیپ خاص طور پر ادا ہوئی۔

کی جو حاکم نے ذرا تیز نظر سوئے حسینؑ
آگیا تیغ بکف قوتِ بازوئے حسینؑ

صفدر صاحب اپنی شیروانی کی آستین اُس طرح تو نہ چڑھا سکے جیسے انگرکھا پہننے والے مرثیہ خواں چڑھا لیا کرتے تھے مگر انھوں نے اپنے تیور اور ہاتھ کے اشارے سے اس شعر کا پورا تاثر قائم کر دیا۔

اس کے بعد مرثیے کے وہ بند آئے جن میں حُر کی فوج کے آجانے اور اس کو امام علیہ السّلام کے سیراب کرانے کا واقعہ نظم ہوا ہے۔ یہاں محسوس ہوا کہ صفدر صاحب اُن واقعات سے ہٹ کر جو عام طور پر مرثیوں میں نظم ہوتے ہیں

ایک ایسے واقعہ کو جو کم ہی نظم ہوا ہے، سامنے لا رہے ہیں مرثیہ کے اس حصّے کے جو بند سب سے زیادہ نمایاں ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

چھاگلیں لے کے بڑھا آپ علمدارِ جری
فرس و قاطر و اُشتر ہوئے سیراب سبھی
سوکھے ہونٹوں پہ نمایاں تھی تشکّر کی تری
دل عقیدت سے بھرا آنکھ ندامت سے جھکی
شرمِ احسان سے ہوئی فوجِ ستمگر پانی
اِس کو کہتے ہیں کرم ہو گئے پتھر پانی

شاہ تھے حلم سے مجبور رضا کیا دیتے
حُر کے انجام سے واقف تھے سزا کیا دیتے
اپنے پروانے کو شعلوں کی ہوا کیا دیتے
حُر تھا حُر اُس کو دُعاؤں کے سوا کیا دیتے
سب کو سمجھا کے ولی ابنِ ولی نے روکا
اپنے ضیغم کو حسین ابنِ علی نے روکا

پھر امام علیہ السّلام کا کربلا میں ورود دکھایا گیا ہے اور اس سلسلے میں ایک غیبی آواز آتی بتائی گئی ہے۔ اس کی بابت متعدد بند ہیں جو روایتی مرثیہ نگاری کے دائرے سے نکل کر جدید فکری شاعری کے دائرے میں آجاتے

ہیں۔ اس حصے کو سُن کر لکھنؤ کے ایک صاحب نے مجھ سے کہا "یہ مرثیہ نہیں ہے اس میں مرثیت سی ہے۔" مگر میں سمجھتا ہوں کہ صفدر صاحب نے یہاں صنفِ مرثیہ کی اُس کمی کو پورا کر دیا جس کی طرف میں نے مرثیوں پر اپنے مضامین میں بار ہا اشارہ کیا ہے۔ یہ بند اُس جدت کی مثال ہے۔

اے کہ سینہ ہے ترا نورِ خدا کی منزل
ہو مبارک تجھے یہ کرب و بلا کی منزل
آ گئی سامنے تسلیم و رضا کی منزل
یہ وہ منزل ہے کہیں جس کو وفا کی منزل
اہلِ عرفاں کو ملے گا یہیں عرفاں کا سُراغ
عشق پائے گا یہیں کوچہ جاناں کا سُراغ

یہاں لگے ہاتھوں صفدر صاحب کے مرثیہ کی ایک مخصوص صفت کی بابت بھی کچھ کہتا چلوں تو بہتر ہوگا۔ یوں تو صفدر صاحب نے زیادہ تر مرثیہ کی روایات ہی کے مطابق سب کچھ لکھا ہے۔ مگر اُن کے سامعین اور روایتی مرثیہ خوانوں کے سامعین میں ایک فرق یہ آ گیا ہے کہ اول الذکر طبقہ یورپ کی ایپک شاعری سے بھی واقف ہے اور اس کے سامعین رزمیہ میں وہ فلسفیانہ اور اشارتی معنی خیزی بھی ڈھونڈھتے ہیں جو یورپ کی رزمیہ شاعری کی امتیازی صفت ہے اور جس کی بنا پر ملٹن نے اپنی رزمیہ کا مقصد انسان کو خدا کے طریقے سکھانا بتایا تھا۔ ہمارے مرثیہ نگار اس طرف کبھی نہیں گئے۔ اور اسی لئے میں مرثیہ کو ایپک کا مترادف کہنے سے انکار کرتا رہا ہوں۔ لیکن صفدر صاحب کے مرثیہ

ے آخر میں خصوصیت کے ساتھ ایک کمی یہ صفت بھی آگئی ہے جو اس قسم کے بندوں سے نمایاں ہوتی ہے جیسے

بسکہ عاشور کے دن سخت تھی عباس کی پیاس
پھر بھی دریا میں جو اُترے تو رہے جمع حواس
یوں بھری مشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ و الیاسؑ
خنکیٔ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس

آبرو فرض کو توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نَو دلِ اربابِ ولا کو بخشی

نکلے دریا سے تو خوں اپنا بہاتے نکلے
ریگِ ساحل کو لبِ خشک دکھاتے نکلے
عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے
صبر و ایثار کی تاریخ بناتے نکلے

پیاس اِس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

قافلہ وقت کا گو زحمتِ ہر گام میں ہے
ماندگیٔ شُہدا راحتِ آرام میں ہے
درد اس تشنہ لبی کا دلِ ایام میں ہے
خونِ دل آج بھی پانی کے عوض جام میں ہے

بچے لیتے ہیں جو گرمی میں کبھی پیاس کا نام
لب پہ آجاتا ہے بیساختہ عباس کا نام

یہی نہیں بلکہ اس کے بعد کے سب ہی بند درسِ فلسفہ کے اُس عالم میں چلے جاتے ہیں جس کو لکھنؤ والے مرثیت سے الگ کوئی چیز کہیں گے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ مرثیہ کو وہ گہرائی دینے کی مثال ہے جس سے وہ اب تک تہی دست تھا۔

اس مرثیہ میں بزم اور رزم کے بھی نئے میدان نظر آئے۔ حضرت اُمِّ کلثوم اور جنابِ عباس کا مکالمہ بزم کی اور حضرت عباس کی آٹھویں شب میں پانی لانے میں کامیابی رزم کی کامیاب مثالیں ہیں۔

مرثیہ خوانی میں رزمیہ حصہ پڑھنا ہمیشہ سے ایسا مشکل کام سمجھا جاتا ہے کہ ایڑی کا پسینہ چوٹی کو آجاتا ہے۔ صفدر صاحب نے رزمیہ بندوں کو جس جوش و خروش کے ساتھ ادا کیا اس کا اندازہ مجلس میں موجود ہو کر دیکھنے ہی سے ہو سکتا تھا۔ اِس حصّے کے پڑھنے میں اُن کے چہرے اور بُشرے سے وہ خاص جلال نمایاں ہو رہا تھا جو مجاہدین پر جہاد کے وقت طاری ہو جاتا ہے۔ اُن کی آواز میں ایک خاص زور آ گیا تھا جس نے اُن کے سامنے رکھے ہوئے مائکروفون کو بلا ضرورت ثابت کر دیا تھا۔ اُن کے ہاتھوں کی حرکت اُن کے اشعار کے معنوں کی پوری ترجمانی کر رہی تھی۔ مجلس واہ واہ اور مکرّر سہ کرر کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔

صفدر صاحب نے حقیقتاً مرثیہ خوانی کے فن کو جو زمانے کے چکّر سے ختم ہوتا جا رہا تھا نئی زندگی بخش دی ہے۔ اور مرثیہ نگاری میں بھی نیا راستہ پیدا کر دیا ہے۔ اُن کے مرثیہ میں مربوط واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نئے احساس، نئے اندازِ بیان، جدید ترکیب تراشی اور حُسنِ قافیہ و ردیف کا بھی وہ کمال ملتا ہے جو شاعری کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ اُن کا مرثیہ سُن کر میں تعجب کے عالم میں

تھا کہ ایسے کمال کی چیز کیسے وجود میں آ گئی کہ یکایک غیبی جواب آیا ؎

ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آ گئی ہے خلدِ بریں سے

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی
مطبوعہ ہفت روزہ "جھنکار" کراچی
شمارہ ۳۵ جلد ۱۵ سنہ ۱۹۶۴ء

(۱)

سالکِ منزلِ تسلیم و رضا تھے عباس
نیّرِ بُرجِ اِمامت کی ضیا تھے عباس
پیکرِ خاک میں حیدر کی دُعا تھے عباس
بہرِ شبیرؑ مشیّت کی عطا تھے عباس

اہلِ حق اِن کو زعیم الشہدا کہتے ہیں
اِن کے اِخلاص کو معیارِ وفا کہتے ہیں

(۲)

اِن کی تخلیق ہوئی دین کی نُصرت کے لئے
فرض نے اِنکو چُنا اپنی وضاحت کے لئے
چہرہ تصویر بنا رنگِ شہادت کے لئے
اِن کی تلوار بنی ہاتھ مشیّت کے لئے

گُلِ زہرا نہ سہی سروِ چمن ہیں یہ بھی
مہرِ تابانِ اِمامت کی کِرن ہیں یہ بھی

(۳)

عزم وہ جس کے لئے تنگ ہو ظرفِ کونین
وہ شجاعت جو بنی قوتِ بازوئے حسین
وہ جلالت کہ جو تھی آیتِ ربّ الثقلین
ہمہ تن حوصلۂ فاتحِ صفّین و حُنین
سر بسر باپ کے اوصاف کی تنویر لئے
آئینہ عرش سے اُترا وہی تصویر لئے

(۴)

دودھ سے ماں کے ملی جرأت وہمت اِن کو
خونِ حیدر نے دیا جوشِ شجاعت اِن کو
خلقِ شبّر نے سکھائی تھی مروّت اِن کو
عزمِ شبیر نے بخشی تھی جلالت اِن کو
جذبۂ شیرِ خدا قوتِ ایمانِ حسین
ایک جا زورِ علی حُسنِ حسن شانِ حسین

(۵)

اِن کو اسلاف کی اِک زندہ نشانی کہئے
ثانیٔ شیرِ خدا جعفرِ ثانی کہئے
ہیبتِ رُخ کو شجاعت کی جوانی کہئے
تابِ رُخسار کو تلوار کا پانی کہئے
یہ وہ پانی کہ شجاعت کا ہے قلزم جس سے
ہوا دو لاکھ کے لشکر میں تلاطم جس سے

(۶)

اے مری طبعِ رَسا ذہن کی پرواز دکھا
اے سخن معجزۂ نطقِ خدا ساز دکھا
اے زباں جوہرِ آئینۂ اعجاز دکھا
جنبشِ شہپرِ جبریل کا انداز دکھا
عرش سے حُسنِ معانی کی ضیا آنے لگے
صاف پردوں کے سرکنے کی صدا آنے لگے

(۷)

مدحِ عباسؑ کا منصب مری قسمت کو ملا
ایک اک بیت پہ لینا ہے محمدؐ سے صلا
ہاں مری طبعِ چمن خیز وہ گُلزار کھلا
جس کے پھُولوں کو لگی ہو نہ گُلستاں کی ہوا
ذہن بیدار ہوں یوں بُوئے گُلِ تر پھیلے
دُور تک نکہتِ گیسوئے معنبر پھیلے

(۸)

جلوہ نورِ حسینی کی ہے عباسؑ میں ضَو
اِن کے آئینے پہ ہے شیرِ خدا کا پَرتَو
پہنچی اس شمع میں سوزِ دلِ شبیر کی لَو
آیتیں مصحفِ رُخسار میں پیدا ہوئیں سَو
فیضِ شبیر سے ذرّے میں دَمک آنے لگی
غنچہ چٹکا گُلِ زہرا کی مہک آنے لگی

۹

ہوئے پیدا تو کھلی گود میں شبیر کی آنکھ
عمر بھر دیکھی اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ
ہر بُنِ مُو سے نمایاں ہوئی تنویر کی آنکھ
آنکھ وہ آنکھ کہ کہیئے جسے تاثیر کی آنکھ
عارضِ سبطِ پیمبر کی ضیا کو دیکھا
آنکھ کچھ اور کھُلی جب تو خدا کو دیکھا

۱۰

ساتویں بار جو اس چاند نے دیکھا مہِ عید
ماں نے آراستہ کی گھر میں یہ تقریبِ سعید
پائے شبیر پہ رکھ کر سرِ فرزندِ رشید
کر دی اِک رشتۂ اخلاص کی توثیقِ مزید
ہوئی عباس کو تفویض غلامیِ حسینؑ
لوحِ قسمت پہ کھُدا نامِ گرامیِ حسینؑ

نظر آئی تو اسی صاحبِ توقیر کی آنکھ

(۱۱)

علم کا شوق تھا مائل ہمہ دانی کی طرف
مُلتفت ذوقِ نظر حُسنِ معانی کی طرف
جب بڑھی عمر لڑکپن سے جوانی کی طرف
ہاتھ بڑھنے لگے تیغِ صفہانی کی طرف
کتنی بھرپور سجی کتنی طرحدار آئی
ہاتھ میں بیٹے کے جب باپ کی تلوار آئی

(۱۲)

یوں ہی جب تیئس برس عمر کی تکمیل ہوئی
اور حالات کی اِس طَور سے تشکیل ہوئی
شانِ دین شوکتِ اَورنگ میں تبدیل ہوئی
ہوسِ جاہ میں یہ سعی بہ تعجیل ہوئی
کہ محمدؐ کے گھرانے کو مٹایا جائے
اِس چراغِ اَبدّیت کو بجُھایا جائے

(۱۳)

ہوئے عباس اُسی دَورِ تلاطم میں جوان
دل میں تھے، مثلِ علی خدمتِ حق کے ارمان
وہی تیور وہی قوت وہی کس بَل وہی شان
ہر نظر جذبۂ اخلاص و صداقت کی زبان
دل سے آواز یہ آتی تھی اُجالا کیجئے
عزم کہتا تھا کہ دُنیا تہہ و بالا کیجئے

(۱۴)

اِمتحاں گاہِ شجاعت ہوا دربارِ ولید
جب کہ موصول ہوا شام سے یہ حکمِ یزید
جس میں تھی شاہ سے بیعت طلبی کی تاکید
ورنہ مانیں تو کیا جائے وہیں اُن کو شہید
کی جو حاکم نے ذرا تیز نظر سوئے حسینؑ
آگیا تیغ بکف قوتِ بازوئے حسینؑ

(۱۵)

کہا للکار کے اَو حاکمِ سفّاک خموش
والیِ شام ہے کیا اے سگِ ناپاک خموش
اُس کی بیعت کرے سبطِ شہِ لولاک خموش
منھ سے کیا کہہ گیا تو منھ میں ترے خاک خموش
دیکھتا کیا ہے اِدھر آنکھ دکھانے والے
کس سے دبتے ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

(۱۶)

ہیبتِ شیر سے گونگی ہوئی حاکم کی زبان
گرچہ سر دفترِ اَشرارِ مدینہ مروان
ذہن پر اُس کے مسلّط تھا مثالِ شیطان
پھر بھی وہ چپ رہا جاتے رہے اُسکے اَوسان
آنکھیں نیچی ہوئیں اُٹھ کر اُنھیں ملنے نہ دیا
رُعبِ جرّار نے کمبخت کو ہلنے نہ دیا

۱۷

عارضی طور پہ یوں ٹل تو گئی بات مگر
مصلحت دیکھ کے حضرت نے کیا عزمِ سفر
رات کو قبرِ نبیؐ سے ہوئے رخصت سرور
چل پڑے خانۂ کعبہ کی طرف وقتِ سحر
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ صفا ساتھ لئے
یعنی جن جن کو مشیّت نے چنا ساتھ لئے

۱۸

راہ طے کر کے ہوئے داخلِ مکّہ شبیر
چار سُو پھیل گئی جلوۂ حق کی تنویر
اَرضِ کعبہ کی بڑھی گردِ قدم سے توقیر
سیرتِ پاک نے دکھلا دی نبیؐ کی تصویر
حُسنِ اخلاق کا کلمہ پڑھا بیگانوں نے
آتے ہی گھیر لیا شمع کو پروانوں نے

(۱۹)

قاصد آنے لگے لے لے کے وفا کے پیغام
گرمِ سازش ہوا سُن کر یہ سخن والیٔ شام
خانۂ حق میں بچھا دیکھ کے تزویر کا دام
آپ نے کھول دیا باندھ کے حج کا اِحرام
سُن کے حالات کی خاموش گواہی آخر
اپنی منزل کو روانہ ہوا راہی آخر

(۲۰)

پھر وہی دامنِ صحرا تھا وہی گردِ سفر
سایۂ نخل نہ تھا راہ میں تا حدِّ نظر
ہر قدم مرحلۂ سخت تھا سرِ راہ گذر
پہنچے منزل پہ زبالہ کی تو آئی یہ خبر
قتل مسلمؑ ہوئے کوفہ میں قیامت آئی
ابنِ مرجانہ کے قبضے میں حکومت آئی

(۲۱)

حادثہ یہ دِل عباسؑ کے حق میں ہوا تیر
زوجۂ حضرتِ مسلم تھیں حقیقی ہمشیر
دی تسلّی یہ بہن کو کہ نہ ہو یوں دل گیر
اے خوشا مسلمِ جاں باز اور انکی تقدیر
وہ ہوئے فدیۂ سلطانِ زمن صبر کرو
یہ تو اِک شُکر کا موقع ہے بہن صبر کرو[1]

(۲۲)

تم کو معلوم نہیں مقصدِ عزمِ شبیر
طالبِ تخت نہیں زاہدِ قانع بہ حصیر
چاہتا ہوں کہ نہ ہو عدلِ خدا کی تحقیر
امتحاں گاہ میں ہیں آج صغیر اور کبیر
مانگ اور کوکھ ہے کیا امرِ الٰہی میں بہن
امتحاں فرض کا ہوتا ہے تباہی میں بہن

[1] یہ تو صورت ہے سعادت کی بہن صبر کرو

(۲۳)

ہو نہ مایوس ابھی قہرِ خدا راہ میں ہے
رحم گو طینتِ مولائے حق آگاہ میں ہے
ولولہ نُصرتِ حق کا بھی دلِ شاہ میں ہے
جوہرِ عدل بھی شمشیرِ ید اللہ میں ہے
آپؑ چاہیں تو ابھی ظلم کا منہ فق کر دیں
ایک انگلی سے سیاہی کا جگر شق کر دیں

(۲۴)

الغرض قافلہ ٹھہرا نہیں آگے ہی بڑھا
مائلِ قطعِ مسافت رہے شاہِ دوسرا
آ کے ملتے گئے رستے میں کچھ اربابِ صفا
پائے اقدس پہ فرزدق نے بھی آنکھوں کو ملا
عزمِ شبیر سے عالم کی نظر دنگ رہی
دل کی آواز سے رفتار ہم آہنگ رہی

؎ آپ چاہیں تو ابھی ظلم کا منھ فق ہو جائے
اک اشارے میں سیاہی کا جگر شق ہو جائے

(۲۵)

قادسیہ کے قریں تھا وہ گروہِ مدنی
سامنے دشت سے بیساختہ آندھی سی اُٹھی
دامنِ گرد پھٹا فوج نمودار ہوئی
شہِ والا کے رفیقوں نے نظر تیغ پہ کی
بولے عباسؑ کہ کیوں سر پہ چڑھے آتے ہو
کس نے دی تم کو اجازت کہ بڑھے آتے ہو

(۲۶)

باادب ہو یہ ہے سرکارِ خداوندِ زمیں
میرا سردار ہے ناموسِ دو عالم کا امیں
وارثِ علمِ نبیؐ دوشِ محمدؐ کا مکیں
خوں کا دریا نہ بہادوں تو میں عباس نہیں
ہٹیں[1] شغالوں کی قطاریں یہ پیادے کیا ہیں
کاٹ[2] کر ڈھیر لگادوں گا کبادے کیا ہیں

[1] یہ رسالہ یہ قطاریں یہ پیادے کیا ہیں
[2] زندہ رہنا ہے تو کہہ دو کہ ارادے کیا ہیں

(۲۷)

کس کی ہمت تھی کہ دیتا کوئی غازی کو جواب

شدّتِ تشنہ دہانی سے کلیجے تھے کباب

کئی دن سے نہ ملا تھا انھیں اک قطرۂ آب

ہر تگ و دَو نے دکھایا تھا تماشائے سراب

مشکیں خالی تھیں اور اشکوں سے بھری تھیں آنکھیں

سائلِ فیضِ امامِ مَدنی تھیں آنکھیں

(۲۸)

افسرِ فوج تھا حُر ابنِ ریاحی اُن کا

بات جو پیاس کی شدّت سے نہ کر سکتا تھا

حال یہ دیکھ کے شبیر کا دل بھر آیا

مضطرب ہو کے یہ عباس سے حضرتؑ نے کہا

اِن کے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے دُعا لو بھائی

اپنے اللہ کے بندوں کو بچا لو بھائی

ؑ ہو کے بے چین یہ عباس سے حضرت نے کہا

(۲۹)

حکم ہونٹوں سے نہ نکلا تھا کہ تعمیل ہوئی
مشکیں اُونٹوں سے اُتاری گئیں تعجیل ہوئی
رُحم آسودہ ہوا فرض کی تکمیل ہوئی
دیکھتے دیکھتے صحرا کی زمیں جھیل ہوئی
گھِر کے ابرِ کرمِ ساقیٔ کوثر آئے
مشک کاندھے پہ اُٹھائے علی اکبر آئے

(۳۰)

چھاگلیں لے کے بڑھا آپ علمدارِ جری
فرس و قاطِر و اُشتر ہوئے سیراب سبھی
سوکھے ہونٹوں پہ نمایاں تھی تشکّر کی تری
دل عقیدت سے بھر آ آنکھ ندامت سے جھکی
شرمِ احساں سے ہوئی فوجِ ستمگر پانی
اِس کو کہتے ہیں کرم ہو گئے پتھر پانی

ٹ کرم

(۳۱)

ہوا اُس روز وہیں دین کے لشکر کا قیام
دوسرے دن تھے مہیائے سفر شاہِ انام
اِرکبو کہہ کے ہوئے زیب دہِ زیں جو امام
حُر نے پاس آکے پکڑ لی فرسِ شہ کی لجام
عرض کی اَور کسی سمت نہ جائیں حضرت
راہ کوفے کی اِدھر ہے اِدھر آئیں حضرت

(۳۲)

حُر نے ہر چند یہ چاہا کہ نہ ہو بے ادبی
نرم لہجہ تھا مگر بات تھی گستاخی کی
بس یہ سُننا تھا کہ انصار کی تلوار کھنچی
سینۂ حُر پہ تھی عباس کے نیزے کی اَنی
ملتجی اِذن کا تھا قوتِ بازوئے حسینؑ
آنکھ تھی منتظرِ جنبشِ ابروئے حسینؑ

(۳۳)

شاہ تھے حلم سے مجبور رضا کیا دیتے
حُر کے انجام سے واقف تھے سزا کیا دیتے
اپنے پروانے کو شعلوں کی ہوا کیا دیتے
حُسنِ تھا حُر اُس کو دُعاؤں کے سوا کیا دیتے
سب کو سمجھا کے ولی ابنِ ولی نے روکا
اپنے ضیغم کو حسین ابنِ علی نے روکا

(۳۴)

جوڑ کر ہاتھ کہا حُر نے کہ مجبور ہوں مَیں
اُمر ہے لائقِ تعزیر پہ مامور ہوں مَیں
اپنی اس شومیٔ تقدیر سے رنجور ہوں مَیں
سجدے شاہد ہیں غلامِ شہِ جمہور ہوں مَیں
آرزو یہ ہے کہ حضرت نہ مصیبت میں پڑیں
کون چاہے گا کہ سرکار ہلاکت میں پڑیں

(۳۵)

آپ ہیں سرورِ دیں بادشہِ کون و مکاں
نورِ حق، شمعِ ہدیٰ، زینتِ بزمِ دو جہاں
وہی کر سکتا ہے وصفِ شہِ ابرار بیاں
دھو[1] جو لے کوثر و تسنیم کے پانی سے زباں
میں ہوں حاضر متوجہ ہو جدھر پائے صواب
آپ کا عزمِ ہمایوں ہے سراپائے صواب

(۳۶)

میرے ماں باپ فدا دین کے سردار ہیں آپ
حُر مرا نام ہے اور سیدِ احرار ہیں آپ
غور[2] کیجے مری مجبوری پہ مختار ہیں آپ
دیجیے اتنی رضا رحمتِ غفار ہیں آپ
ساتھ ہو گردِ سواری کے یہ بندہ پیچھے
آپ[3] آگے رہیں اور میرا رسالہ پیچھے

[1] دھوئے جو کوثر و تسنیم کے پانی سے زباں
[2] میں ہوں مجبور مگر مالک و مختار ہیں آپ
[3] آپ آگے ہوں لیے میرا رسالہ پیچھے

(۳۷)

الغرض شاہ بڑھے سرحدِ عرفاں کی طرف
رُخ شناور نے کیا شورشِ طوفاں کی طرف
لے گئی دل کی کشش منزلِ جاناں کی طرف
مُڑ گئی رحمتِ معبود بیاباں کی طرف
آئی آواز مبارک ہے اِرادہ تیرا
قابَ قوسین سے نزدیک ہے جادہ تیرا

(۳۸)

اے کہ سینہ ہے ترا نورِ خدا کی منزل
ہو مُبارک تجھے یہ کرب و بلا کی منزل
آگئی سامنے تسلیم و رضا کی منزل
یہ وہ منزل ہے کہیں جس کو وفا کی منزل
اہلِ عرفاں کو ملے گا نہیں عرفاں کا سراغ
عشق پائے گا نہیں کوچۂ جاناں کا سراغ

(۳۹)

دامنِ موسمِ گُل ہے ترے دامن کی ہوا
جس سے وابستہ رہے گی مری رحمت کی گھٹا
مطلعِ نور رہے گی ترے مدفن کی فضا
خاکِ مشہد کو ملے گا شرفِ خاکِ شفا
بِک چکی میری رضا اس کا خریدار ہے تو
آج سے دولتِ کونین کا مختار ہے تو

(۴۰)

سُن کے یہ نعرۂ حق اسپِ حق آگاہ رُکا
سونگھی جُھک کے زمیں اور فرسِ شاہ رُکا
کارواں کیوں نہ ستاروں کا رُکے ماہ رُکا
شقّۂ رایتِ اِسلام سرِ راہ رُکا
پیاسے بچّوں کے بلکنے کی صدا آنے لگی
بُوئے خوں لے کے ترائی سے ہوا آنے لگی

(۴۱)

لبِ دریا قدمِ سیّدِ اکرم ٹھہرے
مَوکبِ شاہ رُکا حامی و ہمدم ٹھہرے
اب بڑھے کون کہ سُلطانِ دوعالم ٹھہرے
خم تھا مجرے کیلئے ماہِ محرم ٹھہرے
ناخدا کشتیٔ اُمّت کا لبِ جُو اُترا
تھام کر اپنے علمدار کا بازو اُترا

(۴۲)

دوسری ماہِ محرم سے دہم تک پیہم
امتحاں گاہ میں تھے نازشِ آدم کے قدم
مرحلے عشق کے اور فرض کے جتنے تھے بہم
سب میں عباسِ علی شاملِ سُلطانِ اُمم
تا بہ عاشور رہے کارِ امامت میں شریک
جس طرح شیرِ خدا کارِ رسالت میں شریک

(۴۳)

دیکھ کر بے ادبیٔ سپہِ کوفہ و شام
کبھی ہوتا تھا جو برہم وہ علی کا ضرغام
پیار سے دوشِ مبارک کو تھپکتے تھے امام
ہنس کے کہتے تھے کہ غصّہ ہے شجاعت پہ حرام
مرحمت شاہ کی جب آئینہ دکھلاتی تھی
ہر شکن ابروئے عباس کی مٹ جاتی تھی

(۴۴)

کہیں تدبیرِ جفا تھی کہیں دامِ تزویر
کہیں یہ فکر کہ دریا پہ نہ ٹھہریں شبیر
کہیں ہر بات میں تھی آلِ نبی کی تحقیر
کہیں یہ گھات کہ اولادِ پیمبر ہو اسیر
ہر مہم جس پہ بہم مرضیٔ شبیر ہوئی
ناخنِ جرأتِ عباس سے تسخیر ہوئی

ہر وہ عقدہ کہ جو تشویش فزا ہوتا تھا (۷۰) ناخنِ جرأتِ عباس سے وا ہوتا تھا

(۴۵)

معرکہ پہلا پسِ داخلۂ کرب و بلا
موکبِ دین کے ترائی میں اُترنے پہ ہوا
دشمنانِ شہِ ذی شاں کو یہ منظور نہ تھا
کہ لبِ نہر خیامِ شہِ والا ہوں بپا
گھاٹ اُدھر روکنے بے دین و جفا کار بڑھے
اِس طرف غیظ میں عباس علمدار بڑھے

(۴۶)

تیغ پر ہاتھ تھا اور دوش پہ بے چین تھی ڈھال
آگیا جوشِ وغا آنکھ کے ڈورے ہوئے لال
پیچ و خم کھا کے ہلے زلف کے بکھرے ہوئے بال
دی شجاعت نے ندا اے اسداللہ کے لال
ایک لمحے کے لیے اِذنِ وغا مِل جائے
چینِ ابرو کی قسم گوئے زمیں ہل جائے

(۴۷)

پیش قدمی کوئی کرتا یہ نہ تھی تاب و مجال
ابتری فوج میں ظاہر ہوئی جیسے بھونچال
شاطرانِ سپہِ شام تھے بھولے ہوئے چال
بدحواسی میں سمجھنے لگے تلوار کو ڈھال
دوش پر جائے کماں خنجرِ بُرّاں رکھا
تیغ ترکش میں رکھی میان میں پیکاں رکھا

(۴۸)

اِس تلاطم کی ہوئی سبطِ نبی کو جو خبر
بھائی کے جوشِ محبت پہ ہوا آب جگر
اشک آنکھوں سے بہے ریشِ مبارک ہوئی تر
بڑھ کے فرمایا کہ اے حیدرِ صفدر کے پسر
روک لو ہاتھ یہ اُمّت کہیں برباد نہ ہو
میرا منشائے شہادت کہیں برباد نہ ہو

(۴۹)

کیوں خفا ہوتے ہو شبیر ہے راضی بہ رضا
اُمّتِ جَد ہیں رہے اِن کو مُبارک دریا
انکی خواہش ہے تو ریتی ہی پہ خیمے ہوں بپا
جو فریضہ ہے ہمارا بہ سہولت ہو ادا
مجھ پہ روشن ہے جو کچھ پردۂ تقدیر میں ہے
میرے غازی یہ ترائی تری جاگیر میں ہے

(۵۰)

دیکھتا ہوں میں مشیّت کے اشارے عباس
تم بسو گے اسی دریا کے کنارے عباس
موجیں دہرائیں گی افسانے تمہارے عباس
مرے پیارے مرے اللہ کے پیارے عباس
سیرتِ جعفرِ طیار دکھانا ہے تمہیں
ایک تاریخ یہاں آ کے بنانا ہے تمہیں

(۵۱)

لبِ اعجازِ امامت سے سُنے جب یہ سُخن

برہمی بھول گئی اپنی اداؤں کا چلن

خود سے شرما گئی آئی ہوئی ماتھے کی شکن

سُرخیٔ غیظ نے چہرے سے سمیٹا دامن

پھر سے بیساختہ پن آگیا تنویروں میں

ولولے قید ہوئے حِلم کی زنجیروں میں

(۵۲)

ضیغمِ شہ پہ جو روشن ہوا منشائے اِمام

تیغِ غازی ہوئی پھر زینتِ آغوشِ نیام

ہٹ کے دریا سے بپا ہو گئے ریتی پہ خیام

محملوں سے اُتر آئے حرمِ شاہِ انام

چین پھر بھی نہ ملا غم کی فراوانی سے

ظلم کی آگ کا آغاز ہوا پانی سے

RU. 205 EC

(۵۳)

خاص احکام لئے لشکرِ اعدا پہنچا
فوج پر فوج رسالے پہ رسالہ پہنچا
روک دو گھاٹ کو کوفے سے یہ رُقعہ پہنچا
جس کی مولا نے خبر دی تھی وہ دن آپہنچا
دِل عباس میں اِک جوشِ فراواں جاگا
جس کو حضرت نے سلایا تھا وہ طوفاں جاگا

(۵۴)

ساتویں سے متردّد ہوئے انصارِ امام
بھر کے اِک مشک بھی پہنچا نہ سکے تا بہ خیام
جب کنواں کھود کے بھی رہ گئے غازی ناکام
اور دبے پاؤں بڑھی آٹھویں تاریخ کی شام
پھر تو وہ شیرِ نیستانِ شجاعت اُٹھا
لے کے اِک جذبۂ تحصیلِ سعادت اُٹھا

(۵۵)

ہوا حاضر بہ سراپردۂ شاہِ دوسرا
پیچھے پیچھے تھی سکینہ لئے بچوں کا پرا
شہ نے پہچان کے تیور نفسِ سرد بھرا
بولے عباس کہ آتی ہے اب آوازِ درا
قافلہ عمر کا منزل کی طرف جاتا ہے
یہ غلام آپ کا ساحل کی طرف جاتا ہے

(۵۶)

اب تو حضرت سُنی جاتی نہیں بچوں کی فغاں
کیا گلا کاٹ کے مر جاؤں میں یا شاہِ زماں
میرا منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں طفلِ ناداں
گاہ آ آ کے دکھاتے ہیں مجھے خشک زباں
دِل پہ گھِر گھِر کے الم و غم کا سحاب آتا ہے
پسرِ ساقیٔ کوثر ہوں حجاب آتا ہے

(۵۷)

ہوش خادم نے سنبھالا تھا اسی دن کیلئے

دلِ مضطر تہہ و بالا تھا اسی دن کے لئے

میری ماں نے مجھے پالا تھا اسی دن کے لئے

فرض نے موت کو ٹالا تھا اسی دن کے لئے

اب تو مولا مجھے لڑنے کی اجازت دیجے

یہ نہ ممکن ہو تو سقائی کی خدمت دیجے

(۵۸)

وعدہ کرتا ہوں کہ تلوار نہ لے جاؤں گا

مشکیں خاموشی سے بھر لوں گا چلا آؤں گا

صبرِ حضرت کا نمونہ انہیں دکھلاؤں گا

سر جھکا کر تبر و تیر و سناں کھاؤں گا

ایک نیزے کی اجازت ہو ضرورت کے لئے

وہ بھی اپنی نہیں مشکوں کی حفاظت کے لئے

(۵۹)

التجا مرضیٔ آقا کے مطابق جو یہ تھی

رُخ سے ظاہر ہوا ایمائے حسینؑ ابنِ علیؑ

دلِ عباس میں اُمید کی بجلی چمکی

تھا بہشتی تو سند مل گئی سقائی کی

اُٹھ کے بازو و جوشِ جن و بشر نے چُومے

ہاتھ اقبال نے اور پاؤں ظفر نے چُومے

(۶۰)

حکمِ سرور سے ہوئے بیس پیادے تیار

جن کی مشکوں کی حفاظت کے لئے تیس سوار

ابنِ نافع سے بھی آگے تھے بُریرِ جرّار

قائدِ دستۂ احرار علی کا دلدار

سب سے آگے تھا علم دوش پہ لہرائے ہوئے

لبِ خشکیدۂ اصغر کی قسم کھائے ہوئے

(۶۱)

چاندنی رات تھی اور گیسوئے شب تا بہ کمر
نورِ پرچم سے خجل عارضِ شاداب قمر
ٹھنڈے ٹھنڈے نفسِ سردسے شبنم کے گہر
بزمِ فطرت کو یہ ڈر تھا کہ نہ لگ جائے نظر
لبِ دریا بنی ہاشم کے قمر کے جلوے
بھیگتی رات کو بخشیں گے سحر کے جلوے

(۶۲)

گھاٹ روکے ہوئے دریا کا عدو چار ہزار
جن کے دل میں تھا محمدؐ کے گھرانے سے غبار
حجر و شیث و عمر لشکرِ شر کے سردار
پُر دَغا، اہلِ جفا، دشمنِ دیں، بد کردار
جنگِ صفین سے بھاگے ہوئے غم کھائے ہوئے
دستِ کرّار سے زخموں کا مزا پائے ہوئے

(۶۳)

بندشِ آب ہیں جوڑے ہوئے سر کو باہم
لاف زن تھے کہ ہٹے ہیں کہیں مردوں کے قدم
بُزدلی کہتی تھی آجائے جو بُوئے ضیغم
ابھی اِک آن میں کھُل جائے شغالوں کا بھرم
گِریں اُٹھ اُٹھ کے غبارِ رہِ صحرا کی طرح
آبرو ہاتھ سے جاتی رہے دریا کی طرح

(۶۴)

سرِ ساحل جو ٹہلتے تھے سَلحشور جواں
اُن کو تکتی تھی حقارت سے ہر اک موجِ رواں
روشنی چاند کی دھیمی وہ میانِ میداں
سحرِ نور کا ہو جیسے دُھند لکے میں سماں
یک بیک دور سے بڑھتے ہوئے سائے دیکھے
کچھ حرمی دوش پہ مشکیزے اُٹھائے دیکھے

ئہ جیسے ہو

(۶۵)

راس و چپ اُن کے محافظ تھے سمندوں پہ سوار
شاہدِ حوصلۂ عزم تھی جن کی رفتار
نہ پسِ پُشت سپر اور نہ کمر میں تلوار
چشمِ افلاک نے دیکھے تھے نہ ایسے جرّار
دلِ شگفتہ تھے دلیروں کے چمن کی صورت
دستِ فولاد میں نیزے تھے کرن کی صورت

(۶۶)

آگے آگے علمِ شیرِ خدا جلوہ فشاں
سایۂ دامنِ رحمت سرِ فوجِ یزداں
وہ علمدار جسے دیکھ کے فوجیں لرزاں[1]
چھپ گئے تیر فگن پھینک کے گوشوں میں کماں
تھی جو ہیبت تو جگرداروں کو روکا نہ گیا
لاکھ دعوے تھے مگر ایک سے ٹوکا نہ گیا

[1] حیراں

(۶۷)

بڑھ کے عباس نے حجّاج کے بیٹے سے کہا

بندشِ آب کا کل شب سے سُنا تھا چرچا

گھاٹ کے روکنے والے ہیں کدھر کچھ نہ کھُلا

لو خبردار کہ ہم جاتے ہیں سوئے دریا

اپنی ضربوں کی نشانی تمہیں دے جائیں گے

کاٹ کر نہر کو بے تیغ کے لے جائیں گے

(۶۸)

تجھ میں ہمّت ہو تو آ دیکھ شجاعوں کا جلال

ہم وہ ہیں چیر کے رکھ دیتے ہیں مہتاب کی ڈھال

جب اُٹھاتے ہیں نظر مہر کو آتا ہے زوال

لیں جو انگڑائی تو ٹوٹے یہ ستاروں کا جال

ہم جو گرجیں تو پہاڑوں کے جگر ہلتے ہیں

قصرِ بدعت کی بنا ہلتی ہے در ہلتے ہیں

(۶۹)

ہمہمہ سُن کے دلاور کا رسالے بھاگے
بُزدلے مر گئے دہشت سے جیالے بھاگے
میسرہ ٹوٹ گیا میمنہ والے بھاگے
قلب ابتر ہوا پہلو کو سنبھالے بھاگے
ہر طرف غُل تھا اُٹھو نیند سے جاگو بھاگو
شیرِ ساحل کے قریب آ گئے بھاگو بھاگو

(۷۰)

اک جواں مرد بھی باقی تھا نہ تا حدِّ نگاہ
خوف سے قعرِ مذلّت میں چھپے تھے بدخواہ
چھٹ گئے فوج کے بادل تو کھلی گھاٹ کی راہ
لے کے مشکیزے بڑھے عرشِ شجاعت کے وہ ماہ
موجیں اُچھلیں قدم آنکھوں سے لگانے کے لئے
پانی بیتاب ہوا مشک میں آنے کے لئے

ے برُجِ شرف کے وہ ماہ

(۷۱)

وہ ترائی کی ہوا سرد وہ ہُو کا عالم
سرنگوں چار طرف فوجِ یزیدی کا حشم
متحیّر تھے ستارے۔ متبسّم ضیغم
نہر پر گاڑ دیا شیر نے حضرت کا علم
لبِ جُو سبز پھریرا جو وہ لہرانے لگا
قبضہ ساحل پہ بہشتی کا نظر آنے لگا

(۷۲)

تابعِ حکمِ علمدار تھے وہ تیسؔ سوار
جن کی ثابت قدمی لفظِ شجاعت کا وقار
جن کے زخموں سے کیا گلشنِ ملّت نے سنگار
خون سے جن کے لکھی وقت نے تاریخِ بہار
جن کا افسانہ روایاتِ نکو کی سرخی
چہرۂ فرض پہ ہے جن کے لہو کی سرخی

(۷۳)

یہی رُودار تھے اُن پیدلوں کی پُشت پناہ
تا لبِ آب جنھیں لائی تھی شبیر کی چاہ
مشکیں بھر بھر کے برآمد ہوئے پیاسے ذی جاہ
فکر تھی آب پہنچ جائے سوئے خیمۂ شاہ
لے کے مشکیزوں کو حلقے میں وہ جرار بڑھے
مرحبا کہہ کے رفیقوں کو علمدار بڑھے

(۷۴)

اُس طرف لیس کمانیں ہوئیں تیر آنے لگے
کر کے سرگوشیاں آپس میں شریر آنے لگے
پنجۂ حرص میں ہو ہو کے اسیر آنے لگے
لے کے ساتھ اپنے شغالوں کی بھیر آنے لگے
کافروں نے جو اُدھر ڈھنگ جفا کے بدلے
یاں بھی تیور غضب و قہرِ خدا کے بدلے

(۷۵)

آئی پیشانیٔ عباس پہ غصّے کی شکن
زُلف بل کھانے لگی مثلِ شہِ قلعہ شکن
کِھل اُٹھا چہرۂ زیبا پہ شجاعت کا چمن
کان میں آئی یداللہ کی آوازِ بِزَن
جوش نے دَورۂ خوں کے جو نفس تیز کیا
ہاتھ نیزے پہ گیا گھوڑے کو مہمیز کیا

(۷۶)

ساتھ ہی سب رُفقا نے بھی سنبھالے بھالے
یا علی کہہ کے فرس فوجِ عدو پر ڈالے
سامنے آئے جو دوزخ کے بسانے والے
ہاتھ میں دیدیئے عصیاں کے قبالے کالے
ڈانڈ پر ڈانڈ سنانوں پہ سنانیں کاٹیں
جو کڑکنے پہ تُلی تھیں وہ کمانیں کاٹیں

(۷۷)

شبّر نے ڈال دی جس سمت غضبناک نظر
اُس کی تلوار گرِی ہاتھ سے اور اس کی سپر
اُس نے مُنہ موڑ کے دیکھا جو بدل کر تیور
وہ دیا بڑھ کے طمانچہ کہ گرا خود اُدھر
موڑ کر اس کی کلائی جو سناں کو چھینا
چھید دی اِس کی زرہ اُس کی کماں کو چھینا

(۷۸)

گرم بازاریٔ میدانِ وَغا تھی ہر سُو
شدّتِ معرکۂ بیم و رِجا تھی ہر سُو
بھیس میں نیزۂ خطّی کے قضا تھی ہر سُو
موت مُنہ کھول کے جویائے غذا تھی ہر سُو
کس تحمّل سے ولی ابنِ ولی لڑتے تھے
وہی انداز تھا جس طرح علی لڑتے تھے

۷۹

ضربِ عباس سے سب فوج کی حالت تھی تباہ
رن میں طوفاں تھا بپا بھاگ رہے تھے گمراہ
اس تلاطم میں یکایک جو پھٹا ابرِ سیاہ
شمسۂ خیمۂ سرور نظر آیا ناگاہ
تھی صدا وقت کی، ہے بارگہِ شاہ قریب
چاند کہتا تھا کہ ہے فاطمہ کا ماہ قریب

۸۰

مطمئن دل سے کیا حملۂ آخر ایسا
اور بھی جس سے ہوئی ہمّتِ باطل پسپا
منتشر ہو گیا دریا کا محافظ دستہ
بج گیا نامِ علمدار کا ہر سُو ڈنکا
دم بخود فوج ہوئی شہرِ خموشاں کی طرح
خاک اُڑنے لگی ڈیروں میں بیاباں کی طرح

(۸۱)

کہہ کے تکبیر رفیقانِ علمدار بڑھے
مالکِ عزم بڑھے صاحبِ کردار بڑھے
سُنی بچوں کی صدا چھیڑ کے رہوار بڑھے
پاس آئے تو مودّب ہوئی رفتار بڑھے
باادب خادمِ سلطانِ اُمم جاتے تھے
لے کے مشکیزے سوئے بحرِ کرم جاتے تھے

(۸۲)

بااثر ہو کے صغیروں کی دعائیں آئیں
دوشِ انصار پہ جنت کی ہوائیں آئیں
مشک کے بھیس میں رحمت کی گھٹائیں آئیں
پانی حاضر ہے یہ سقّوں کی صدائیں آئیں
آج خالی کوئی ساغر کوئی کوزا نہ رہے
مطمئن دل ہوں جو بچّہ کوئی پیاسا نہ رہے

(۸۳)

آج کی رات تو ہے فخر و مباہات کی رات
فتحِ عباس کی شب ہمتِ سادات کی رات
بدر و صفین کے دیرینہ روایات کی رات
خیمۂ شاہ میں مہماں ہے خوشی رات کی رات
کل سے اِک بوند نہ پانی کی کوئی پائے گا
ماں کی آغوش میں معصوموں کو غش آئے گا

(۸۴)

کل سے ہو گا اِسی کوشش میں نبیؐ کا جانی
شکن آلود نہ عباس کی ہو پیشانی
کل سے آئے گا نہ پھر فوجِ خدا میں پانی
اِمتحاں گاہ کی پھر ہو گی فضا طوفانی
معرکے ہونگے اِسی تشنہ دہانی کے لئے
خون سقّے کا بہے گا اِسی پانی کے لئے

(۸۵)

کتنا پانی تھا مری حیرتِ معصوم نہ پوچھ
کتنے سیرابی کو ترسائے حلقوم نہ پوچھ
کتنے انصار رہے پانی سے محروم نہ پوچھ
شدّتِ تشنہ لبی اے دلِ مغموم نہ پوچھ
وقت وہ تھا شہِ والا کا چمن تھا آباد
سب غزالوں سے شہِ دیں کا ختن تھا آباد

(۸۶)

اِتنی[1] تعداد میں کیا کرتا کفالت پانی
اپنی قلّت پہ تھا خود غرقِ ندامت پانی
سوکھے ہونٹوں کو ہوا پھر بھی غنیمت پانی
سب کو خیمے میں مِلا حسبِ ضرورت پانی
جملہ اَطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا
پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہ نے پیا

[1] اتنے افراد میں کیا کرتا کفایت پانی

(۸۷)

پیاس دن بھر کی تھی جی بھر کے نہ پایا سب نے
تشنگی اور بڑھی طول جو کھینچا شب نے
ٹھنڈی سانسیں جو بھریں بنتِ شہِ شیر[۱] نے
پھر تو خود شاہ نے عباس نے اور زینب نے

اپنے حصّے کا بھی بچّوں کو پلایا پانی
بعض انصار نے منھ سے نہ لگایا پانی

(۸۸)

آٹھویں صبح سے دربار میں پانی نہ رہا
خاک اُڑنے لگی سرکار میں پانی نہ رہا
حد ہوئی مرکزِ انوار میں پانی نہ رہا
خیمۂ عترتِ اطہار میں پانی نہ رہا

اُس طرف سے سوئے میداں جو ہوا جانے[۲] لگی
پیاسے اطفال کے رونے کی صدا آنے[۳] لگی

[۱] قافیہ کی بے ضابطگی کا مجھے خود احساس ہے

[۲]، [۳] جاتی تھی

۸۹

نہمِ ماہِ محرم بھی مصیبت کی تھی رات
قہرِ ہر ساعتِ نَولائی تھی آفت کی تھی رات
ظلمِ حاکم کا نمونہ تھی شقاوت کی تھی رات
دن اگر قربِ قیامت تھا قیامت کی تھی رات
سجدۂ حق میں وہ دن رات گزارے سب نے
خاک پر گیسوئے احوال سنوارے سب نے

۹۰

وہ شب و روز جو گزرے شبِ عاشور آئی
اِک کسک دل میں لئے خستہ و رنجور آئی
بزمِ انجم میں چمک درد کی تا دور آئی
داغِ مہتاب میں بھی سوزشِ ناسور آئی
ظلمِ بیجا کے جو اَطوار نظر آتے تھے
شش جہت غم میں گرفتار نظر آتے تھے

(۹۱)

آگ دہکی ہوئی تھی گردِ خیامِ شہِ دیں
چار سو جمع تھے شب خوں کے ارادے سے لعیں
بوند پانی کی نہ موجود تھی خیموں میں کہیں
جاں بلب پیاس سے اطفال تھے مائیں غمگیں
مضطرب تھی کوئی قاسم کوئی اکبر کے لئے
ایک بی بی کا عجب حال تھا اصغر کے لئے

(۹۲)

سخت تشویش کے عالم میں تھے عباسِ حزیں
پیشِ حضرت کبھی پہنچے کبھی زینب کے قریں
نبض کو دیکھ کے عابد کو دعائیں کبھی دیں
چوم لی پیار سے ناشاد سکینہ کی جبیں
فکر زوجہ کی نہ بچوں کی جدائی کا خیال
وجہِ تشویش تھا ہر حال میں بھائی کا خیال

(۹۳)

(۹۳)

لشکرِ شر میں کبھی لے کے یہ پہنچے پیغام

کہ طلبگار ہیں اک رات کی مہلت کے امام

کیا ہو شب بھر کو اُٹھا لو جو شقاوت کے یہ دام

ہم کو اَوراد و وظائف کے علاوہ نہیں کام

دل ہوں یک سُو تو عبادت کا سر انجام کریں

سجدۂ شکر پہ اس زیست کا اِتمام کریں

(۹۴)

صاعقہ بن کے گئے آپ جو پتّا کھڑکا

اشک بھر لائے جو پیاسا کوئی بچّہ تڑپا

کسی خیمے سے اگر آئی صدائے گریا

مضطرب ہو کے چلا بازوئے شاہِ دوسرا

آ کے کلثوم کے خیمے میں قیامت دیکھی

ضبط مشکل تھا وہ ہمشیر کی حالت دیکھی

جو بچّہ کوئی بے حال ہوا — کسی خیمے سے اگر آ گئی رونے کی صدا

(۹۵)

(۹۵)

رُو بہ قبلہ تھیں مصلّے پہ جنابِ کلثوم
رو کے کہتی تھیں کہ اے قادر و حیّ القیوم
گھر گئے ہیں عجب آفت میں امامِ مظلوم
مصلحت تیری کہ اولاد سے ہیں ہوں محروم
کیا کروں نذر کہ ہدیہ[1] نہیں رکھتی کوئی
دل ہے مجبوب کہ فدیہ نہیں رکھتی کوئی

(۹۶)

کل بپا ہوگا یہاں معرکۂ ذبحِ عظیم
کل ثمر لائے گا گلزارِ رضا و تسلیم
کیا کہوں تجھ سے کہ تو خود ہے بصیر اور علیم
دل مرا خنجرِ احساس سے ہوتا ہے دو نیم
جس طرف دیکھتی ہوں موت کی تیاری ہے
میرے احساس پہ یہ رات بہت بھاری ہے

[1] فدیہ اور ہدیہ ہم قافیہ نہیں لیکن محض ایک حرکت کی تبدیلی کو آج کل کے حالات کے پیش نظر جائز سمجھ لیا ہے۔

(۹۷)

صبح جل جائے گا سب خاک میں آباد یہ گھر
لال مسلم کے نہ کل ہوں گے نہ زینب کے پسر
ٹکڑے ہو جائے گا گلزارِ جنابِ شبرؑ
چھد کے رہ جائے گا میدان میں اکبر کا جگر
بھائی آمادہ ہیں شش ماہے کی قربانی پر
رحم کر رحم مری بے سروسامانی پر

(۹۸)

دلِ پُر داغ کسے جا کے دکھاؤں اپنا
تو ہی ہمدرد ہے غم تجھ کو سُناؤں اپنا
کس کو قربان کروں کس کو بناؤں اپنا
کیسے ہمچشموں میں اعزاز بڑھاؤں اپنا
دستگیری ہو پیمبرؐ کی وصی کا صدقہ
رحم کلثوم پہ کر اپنے نبیؐ کا صدقہ

(۹۹)

گوشِ عباس میں پہنچی جو یہ پُر درد صدا
حالِ بیتابیٔ ہمشیر پہ دل بھر آیا
سر جُھکا کر عجب اندازِ سماجت سے کہا
آپ کے جذبۂ ایثار پہ عباس فدا
کام آ جائے بہن کے تو جگر حاضر ہے
فدیۂ راہِ خدا کیجئے سر حاضر ہے

(۱۰۰)

یہ سخن سُن کے بہن چُپ ہوئی چہرہ چمکا
غم و اندوہ کا اُمڈا ہوا دریا ٹھہرا
عجب اندازِ تشکّر سے نگاہوں نے کہا
میرے صفدر یہ بہن تیری شجاعت پہ فدا
یہ دُعا ہے کہ خدا تجھ کو برومند رکھے
سایۂ حضرتِ شبیرؑ میں خرسند رکھے

ؒ تو یہ خستہ جگر

(۱۰۱)

یوں ہی بڑھتی رہی عباس کی ذمہ داری
ہر قدم مرحلہ ہر سانس نئی دشواری
بڑھ کے خود دل نے اٹھائے وہ فرائض بھاری
جن کی تکمیل میں ہوں خون کی نہریں جاری
کبھی نیزوں میں کبھی تیغوں کی دھاروں میں گئے
سر ہتیلی پہ لئے ظلم شعاروں میں گئے

(۱۰۲)

بسکہ عاشور کے دن سخت تھی عباس کی پیاس
پھر بھی دریا میں جو اُترے تو رہے جمع حواس
یوں بھری مشک کہ حیراں ہوئے خضرؑ و الیاسؑ
خُنکیٔ آب کو آنے نہ دیا ہاتھ کے پاس
آبرو فرض کو توقیر وفا کو بخشی
تپشِ نو دلِ اربابِ وِلا کو بخشی

۱۰۳

نکلے دریا سے تو خوں اپنا بہاتے نکلے
ریگِ ساحل کو لبِ خُشک دکھاتے نکلے
عشق اور فرض کی تقدیر جگاتے نکلے
صبر و ایثار کی تاریخ بناتے نکلے

پیاس اِس طرح سے ٹُھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے وفا فطرتِ انسانی کو

۱۰۴

قافلہ وقت کا گو زحمتِ ہر گام میں ہے
ماندگیٔ شہدا حالتِ آرام میں ہے
درد اس تشنہ لبی کا دلِ ایّام میں ہے
خونِ دل آج بھی پانی کے عِوض جام میں ہے

بچّے لیتے ہیں جو گرمی میں کبھی پیاس کا نام
لب پہ آجاتا ہے بیساختہ عباس کا نام

(۱۰۵)

وہی عباس فسانہ ہے جلالت جس کی
آج بھی سینۂ باطل میں ہے ہیبت جس کی
نااُمیدی میں اِک اُمید تھی ہمت جس کی
خستہ حالوں کا بھروسا تھی شجاعت جس کی
پاس زینب کی سمجھتی تھی سہارا جس کو
ہر طمانچے پہ سکینہ نے پکارا جس کو

(۱۰۶)

آپ کے عزم کو یا حضرتِ عباس سلام
آپ کی سیرتِ روشن سے شجاعت خوش نام
جان دی آپ نے اے قوّتِ بازوئے امام
اور جھکنے نہ دیا پرچمِ دینِ اسلام
سینۂ دہر پہ ہر نقش ہے گہرا اِس کا
آپ کے خون سے رنگیں ہے پھریرا اِس کا

(۱۰۷)

ہے ازل سے یہی قانونِ طبیعت آقا
کہ شجاعت ہے اِک ایمان کی شدّت آقا
معجزہ عشق کا تھا آپ کی سیرت آقا
آج بھی عقلِ مشکّک کو ہے حیرت آقا
کٹ گئے ہاتھ تو پھر زیں پہ تھمے تھے کیونکر
پاؤں حضرت کے رکابوں میں جمے تھے کیونکر

(۱۰۸)

نصرتِ روحِ شریعت بخدا آپ نے کی
نہ مثال اُس کی ملے گی جو وفا آپ نے کی
ہاتھ میں مشک و علم لے کے وغا آپ نے کی
سُنّتِ جعفرِ طیّار ادا آپ نے کی
مفتخر آپ سے ہے اِس کی رِوایت آقا
سر بلند آج بھی ہے پرچمِ مِلّت آقا

رایت

یہ جو اِک رابطۂ مشک و عَلم ہے حضرت
اِیک سرمایۂ تہذیبِ اُمَم ہے حضرت
آپ کے دستِ بُریدہ کی قسم ہے حضرت
لکھ کے نام آپ کا سجدے میں قلم ہے حضرت
جذبۂ بندۂ موروثیؔ مولا ہو قبول
اپنے اِس صفدرِؔ ناچیز کا سجدہ ہو قبول

رباعی

ذہنوں کی روش بدلنے والے ہم ہیں
کانٹوں کی زباں مسلنے والے ہم ہیں
سَو بار حریفوں نے ہمیں دیکھ لیا
تلوار کی طرح چلنے والے ہم ہیں

سلام

لگا کے ٹھیس حریفوں کے آبگینوں کو
بڑا عروج دیا ہم نے اِن زمینوں کو

غبار چھونے لگا آسماں کے زینوں کو
کہاں اُچھال دیا ہم نے اِن زمینوں کو

بنا کے چھوڑ گئے ہیں جو شہ نشینوں کو
پکارتے ہیں در و بام اُن مکینوں کو

چڑھا کے آئے تھے ہم پر جو آستینوں کو
وہ آج پونچھ رہے ہیں کھڑے جبینوں کو

غرورِ فن کے سبب جن کے خط نہ گھٹتے تھے
ہماری تیغ نے کاٹا ہے اُن جبینوں کو

فلک نے دیکھ کے گلہائے کربلا یہ کہا
کہاں بسا گئے شبیرؑ اِن حسینوں کو

جبینیں خاکِ شفا سے دمک کے کہتی ہیں
سلام ارضِ مقدّس ترے مکینوں کو

حسینؑ آج نہیں ہیں مگر وہ راہ تو ہے
پکارتی ہے جواب تک ماں آل ہینوں کو

بہارِ غم ہے محرم سے صرف تا بصفر
خدا دراز کرے اور اِن مہینوں کو

زمانہ ان کو سمجھ لے اگر تو جنگ نہ ہو
رواج دے گئے شبیرؑ جن قرینوں کو

کہاں دیارِ نجوم اور کہاں درِ حکّام
گرا رہی ہے ضرورت بلند بینوں کو

شہید ہوتے رہے اقربا مگر شبیرؑ
نگاہِ عفو سے دیکھا کئے لعینوں کو

اِسی کا نام ہے طوفانِ زندگی صفدرؔ
ہوا کہاں سے کہاں لائی ہے سفینوں کو

ڈاکٹر سید صفدر حسین
ایم اے، ایل، ایل، بی (علیگ)
پی، ایچ، ڈی (پنجاب)

تخلیقات

جلوۂ تہذیب (مرثیہ)
آئینِ وفا (مرثیہ)
رقصِ طاؤس (رومانی نظمیں)
چراغِ دیر و حرم (غزلیات)
رقصِ کواکب (جدید نظمیں)
مرثیہ بعد انیس (تنقید)
لکھنوی ادب (تحقیق و تنقید)
کارنامۂ انیس (ترتیب و تالیف)
تاریخِ مرثیہ نگاری (تحقیق و تنقید)
ادب و آزمائش (تنقیدی مضامین)
دام شنیدن (ریڈیائی فیچرز)

جلوۂ تہذیب

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین نے اپنے اِنفرادی اَندازِ فکر اور رزمیہ آہنگ کی آمیزش سے کربلا کی حُزنیہ روئیداد کے بعض سانحات کو اِس طرح بیان کیا ہے کہ اس تخلیق کو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

کلاسکی مرثیہ میں جدید فلسفیانہ گرمی اور جدید رنگ و آہنگ کا اضافہ "جلوۂ تہذیب" کی خصوصیت ہے۔

قیمت: تین روپے

مکتبۂ دانش افروز
۴۵- ارجن روڈ، کرشن نگر لاہور

صرف سرورق - فنون پریس - لاہور میں چھپا